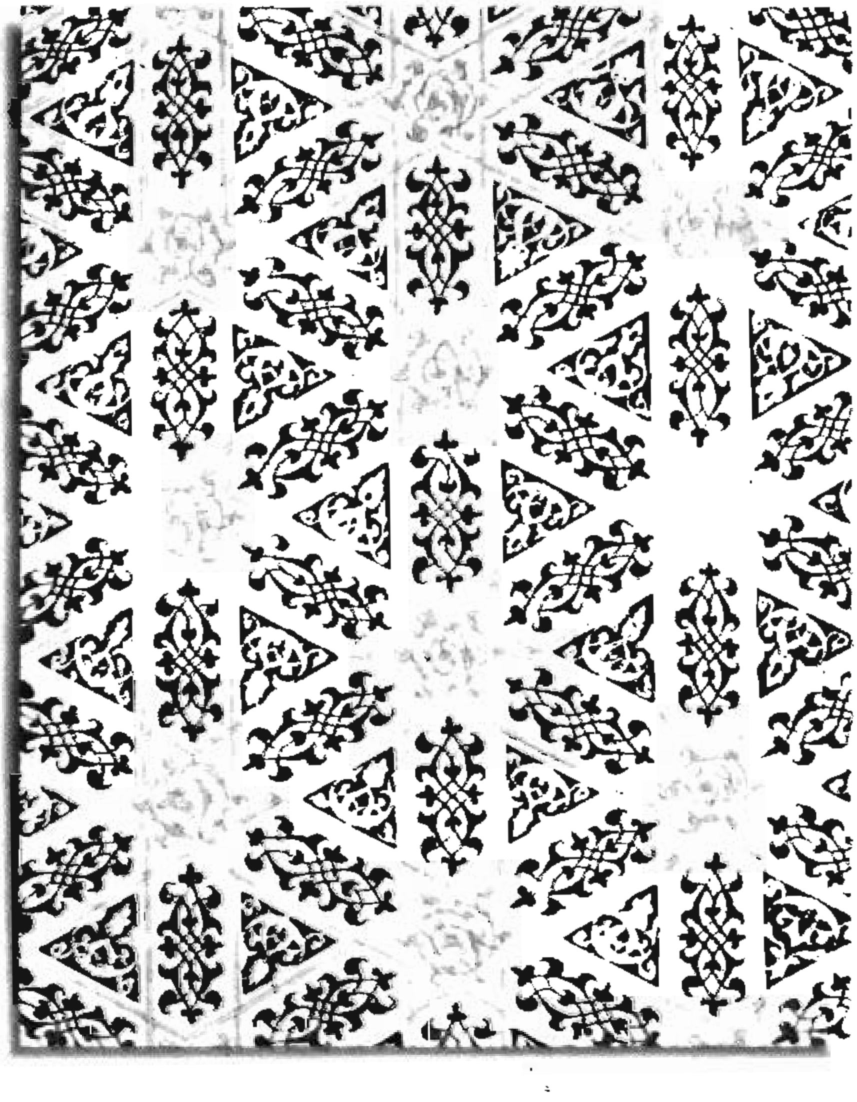
ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مُدیر
خورشید احمد



ادارۂ ترجمان القرآن

آب پارہ
ملتان روڈ
لاہور

گلشنِ احباب فیز I
لاہور

گلشنِ احباب فیز II
لاہور

شاداب کالونی
لاہور

منظرِ کوہسار
اسلام آباد

احباب ایگرو فارم
اسلام آباد

احباب ولاز
مری

ہل ویو اپارٹمنٹ
مری

آٹھ رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کی حامل اور آپ کے کامل اعتماد کی مظہر

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ



اسلام آباد سے متصل مرگلہ ہلز کے حسین دامن میں ایک نیا دلپذیر شہر

منظرِ کوہسار

ترقیاتی کام جاری ہیں

ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ حکومت پنجاب اور ڈسٹرکٹ کونسل راولپنڈی سے منظور شدہ سڑکیں، سیوریج، بجلی پانی، سکول، کمیونٹی سنٹر، قبرستان، مسجد اور ہسپتال، خوبصورت جھیل

30 جون 1997ء تک رعایتی قیمت

پلاٹ 5 مرلہ قیمت 35 ہزار روپے فی مرلہ، پلاٹ 10 مرلہ 32 ہزار روپے فی مرلہ، پلاٹ 20 مرلہ 30 ہزار روپے فی مرلہ بمعہ ترقیاتی اخراجات باقی رقم 3 سال کی سہ ماہی قسطوں میں۔ پانچ ہزار روپے فی مرلہ کا ڈرافٹ بھیج کر بک کرالیں۔

فیروزپور روڈ پر چونگی امرسدھو سے ۲ کلومیٹر ایل ڈی اے سے منظور شدہ

شاداب کالونی

کشادہ سڑکیں، خوبصورت پارکیں، مسجد، ڈسپنسری، سکول، مارکیٹیں، ٹیلیفون اور سوئی گیس کی سہولت موجود، سکول کالج اور بڑے ہسپتال قریب تر۔ 90 فیصد ترقیاتی کام مکمل ہو چکے ہیں۔ کنال، 10، 5 مرلہ اور مربع گز

30 جون 1997ء تک رعایتی قیمت

پلاٹ 5 مرلہ قیمت 35 ہزار روپے فی مرلہ، پلاٹ 10 مرلہ 32 ہزار روپے فی مرلہ، پلاٹ 20 مرلہ 30 ہزار روپے فی مرلہ بمعہ ترقیاتی اخراجات باقی رقم 3 سال کی سہ ماہی قسطوں میں۔ پانچ ہزار روپے فی مرلہ کا ڈرافٹ بھیج کر بک کرالیں۔ پمفلٹ مفت منگوائیں

گلشن احباب فیز II [illegible]

منظر کوہسار [illegible]

تحریکِ اسلامی سے
وابستہ افراد کا با اعتماد ادارہ

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ

بٹ ہاؤس 6 اے فیصل روڈ اولڈ مسلم ٹاؤن لاہور فون 5865371 5869549 فیکس 5837016

ماہنامہ
ترجمان القرآن
مدیر: خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد
جلد ۱۲۴ جون ۱۹۹۷ء صفر ۱۴۱۸ عدد ۶

ترتیب

○ اشارات
مسلم معاشرے کا انتشار — خورشید احمد — ۳
○ فہم قرآن
پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے! — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ — ۱۵
○ تزکیہ و تربیت
سستی اور کاہلی — محمد بشیر جمعہ — ۲۳
○ فقہ و اجتہاد
قانون سازی کے قرآنی اصول — ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی — ۳۳
○ اسلام اور مغرب
اسلامی تحریکیں اور حزب اختلاف کا کردار — پروفیسر ممتاز احمد/ طیب ابو عادل — ۴۵
○ اخبار امت
سوڈان: جھوٹ کا پردہ چاک — مسلم سجاد — ۵۹
انڈونیشیا میں انتخابات — محمد ایوب منیر — ۶۱
وسط ایشیا: حریص نگاہوں کا مرکز — مسلم سجاد — ۶۳
غزہ کے حکمرانوں کی حرکتیں — 〃 — ۶۴
○ رسائل و مسائل — ۶۷
○ کتاب نما — ۷۵
○ مدیر کے نام — ۸۳

ادارتی امور
منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰
فون: ۷۸۴۴۶۰۵
فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور
۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور
فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے
زر سالانہ ۱۵۰ روپے
مشرق وسطیٰ ۵۵۰ روپے
بنگلہ دیش، مسقط ۴۵۰ روپے
بھارت ۴۰۰ روپے
یورپ، مشرق بعید ۶۵۰ روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے
بنک ڈرافٹ
بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

ہمارے پاس اکثر اس قسم کے خطوط آتے رہتے ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی شکایتیں کی جاتی ہیں۔ کوئی صاحب اس بات پر ناراض ہوتے ہیں کہ فلاں شخص (زندہ یا مردہ) کے مضامین رسالے میں کیوں شائع کیے جاتے ہیں۔ کسی کی محض اس بات پر دل آزاری ہو جاتی ہے کہ فلاں شخص (مثلاً ابن القیم) کے لیے رحمہ اللہ کیوں لکھا گیا۔ کوئی صاحب حکم لگاتے ہیں کہ تم وہابی ہو گئے کیونکہ فلاں مسئلے میں تم نے حضرات اہل طریقت سے اختلاف کیا۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ تم متعصب حنفی ہو کیونکہ فلاں مسئلہ میں تم نے حضرات اہل حدیث سے اختلاف کیا۔ ایک صاحب کی رائے میں ہم آزاد خیالی کے مجرم ہیں۔ اور دوسرے صاحب کی رائے میں ہم پر قدامت پرستی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ غرض جس کو اپنے مسلک اور اپنے خیالات کے خلاف کوئی چیز نظر آتی ہے وہ ایک عتاب نامہ ہمارے نام لکھ دیتا ہے۔ ہم ان حضرات سے عرض کرتے ہیں کہ آخر آپ لوگ اس قدر ذکی الحس کیوں ہو گئے ہیں کہ ذرا ذرا سی باتوں پر آپ کے جذبات کو ٹھیس لگ جاتی ہے؟ اور یہ تنگ دلی کیسی ہے کہ اپنی رائے کے خلاف کسی بات کے سننے کا تحمل بھی آپ میں نہیں؟ ہم نہیں کہتے کہ آپ ہماری ہر بات پر امنا وصدقنا ہی کہا کریں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہی حق ہے اور اس کو مان لینا سب پر فرض ہے۔ ممکن ہے کہ ہم غلطی پر ہوں، اور آپ حق پر ہوں۔ اگر آپ ہمیں کسی مسئلے میں غلطی کرتے دیکھیں تو آپ کو حق ہے کہ ہمیں ٹوک دیں، اور راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ کام شکایت اور اظہار غیظ و غضب سے نہیں ہو سکتا۔ ذرا صبر و تحمل اپنے اندر پیدا کیجیے۔ آپ کی رائے کے خلاف جو شخص کچھ کہتا ہے اس کو ٹھنڈے دل سے سنیے اور انصاف کی نظر سے دیکھیے۔ اگر اس کی بات معقول ہو اور حق کے مطابق نظر آئے تو محض اس بنا پر اس کو رد نہ کر دیجیے کہ پہلے سے جن خیالات پر آپ جمے ہوئے ہیں ان سے آپ کو محبت ہو گئی ہے۔ اور اگر آپ اسے خلاف حق سمجھیں تو دلیل و حجت سے اس کے قائل کو سیدھا راستہ دکھائیے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ایک شافعی مسلمان کی شکایت، ترجمان القرآن، جلد ۱۰، عدد ۴، ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ، جون ۱۹۳۷ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مسلم معاشرے کا انتشار: منزل ہے کہاں تیری...

خورشید احمد

اسلام محض ایک روایتی مذہب نہیں---- وہ ایک مکمل دین اور جامع نظام زندگی ہے جو عقیدے، عبادات، انفرادی اخلاق، اجتماعی نظام، قانون، عدالت، دعوت و تبلیغ اور ان کے زیراثر وجود میں آنے والی عالم گیر اور درخشاں تاریخی روایت سے عبارت ہے۔ اسلام کی یہ جامعیت ایک نظری و عملی حقیقت اور اس کی امتیازی شان ہے۔ جہاں اس امرواقعی کا احساس اور اس پر افتخار بجا، وہاں اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ آج بڑی حد تک پوری اسلامی دنیا میں اور خصوصیت سے پاکستان میں مسلم معاشرہ اپنی اصل شان کھوتا جا رہا ہے اور بنیادی طور پر ایک "اسلامی معاشرہ" کی بجائے آج ہمارا سابقہ ایک ایسے مخلوط معاشرے سے ہے جس میں اسلام اور جاہلیت گڈمڈ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف اسلامی تعلیمات اور ہماری تہذیبی روایات کی روشن جھلکیاں ہیں تو دوسری طرف برصغیر کے جاہلی تاریخی اثرات اور مغربی تہذیب و ثقافت کے بڑھتے ہوئے تاریک سائے ہیں۔ بہت سے خیر اور بظاہر بڑی قیمتی دینی علامات کی موجودگی کے علی الرغم بڑے پیمانے پر معاشرہ غفلت کا شکار ہے اور روح اسلام اور اس جوہر کی کمی نظر آتی ہے جو فکرونظر اور سماج اور تمدن کو امتیازی اسلامی شان عطا کرتے ہیں۔ بقول اقبال ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے!

اس غفلت اور محرومی کا احساس اس وقت اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب معاشرے میں کوئی چونکا دینے والا واقعہ رونما ہو جائے اور سارے دل خوش کن دعووں اور احساسات کے باوجود ایک لمحے کے لیے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہمارا حال بھی خوش فہمی میں مبتلا اس خودپسند بادشاہ کا سا تو نہیں جو برہنہ ہونے کے باوجود اس زعم میں مبتلا تھا کہ وہ قیمتی لباس میں ملبوس ہے اور ایک بچے کے معصوم مگر بے باک اظہار خیال نے کہ "بادشاہ تو ننگا ہے" اس کی خودپسندی اور خودستائی کا سارا طلسم کافور کر دیا۔

گذشتہ ایک سال سے ہماری عدالت اور ہماری صحافت ایک ایسے ہی چونکا دینے والے واقعے کے مالہ وما علیہ سے نبرد آزما رہی ہے--- والدین کے خلاف ایک دینی گھرانے کی نوجوان لڑکی کی بغاوت' "پسند کی شادی"' گھر سے فرار' تھانے اور کچہری کے چکر' مقدمہ بازی' قید و رہائی' اپنوں کی گراں باریاں' نام نہاد این جی اوز کی کارفرمائیاں' انسانی حقوق کے نام لیواؤں کی کرم فرمائیاں' میڈیا کی کرشمہ سازیاں' ملکی ہی نہیں بین الاقوامی ایجنسیوں کی دلچسپیاں' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تکلیف دہ واقعہ کا عدالتی تصفیہ مطلوب نہیں بلکہ اسلام' اس کے عائلی قانون بلکہ پوری تہذیبی روایت پر تحکیم کی کوشش اور وہ بھی میڈیا ٹرائل کی شکل میں اصل ہدف ہے! ایک خاندان ہی نہیں پورا ملک اس کرب ناک عمل سے گزرا ہے اور عدالت کے فیصلے کے بعد بھی یہ ٹرائل جاری ہے۔ گویا دو نظریات اور دو تہذیبی روایات دست و گریبان ہیں! اس طرح یہ واقعہ محض ایک فرد یا ایک خاندان کا مسئلہ نہیں رہا ہے' بلکہ ایک ایسی بحث کا عنوان بن گیا ہے جس کی زد میں ہمارا خاندانی نظام بلکہ پوری اسلامی معاشرت ہے۔ نیز اجتماعی اصلاح اور بگاڑ کے سلسلے میں والدین' عدالت اور صحافت کے رول اور ذمہ داریوں کے بارے میں بھی غور و فکر کے متعدد گوشے ہیں جو اس قضیے میں سامنے آئے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر تفکر اور عبرت کی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ اصلاح احوال کے لیے مناسب تدابیر اور اقدامات کی نشان دہی کی جاسکے۔ زندگی کے ان تلخ حقائق اور معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں سے صرف نظر کرنا یا ان پر پردہ ڈالنا مسائل کا حل نہیں--- آنکھیں بند کرنے سے خطرات کبھی ٹلا نہیں کرتے' ان کا مردانہ وار مقابلہ ہی تاریکیوں کو روشنی سے بدل سکتا ہے۔ آج بھی ضرورت ہے کہ ٹھنڈے دل سے مرض کی تشخیص اور صبر و ہمت سے علاج کا سامان کیا جائے۔

جن خاندانی' معاشرتی اور تہذیبی مسائل سے اس وقت ہمارا معاشرہ دوچار ہے وہ محض کسی خاص فرد یا چند افراد اور خاندانوں کا معاملہ نہیں اور مسئلہ بھی صرف یہ نہیں ہے کہ ایک مسلمان لڑکی اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے یا نہیں یا ولی کی مرضی کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ بلاشبہ یہ معاملات بھی اپنی جگہ اہم ہیں اور شریعت نے ان کے بارے میں غیر مبہم رہنمائی فراہم کی ہے' لیکن اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان معاشرے میں ایسے واقعات کیوں رونما ہو رہے ہیں؟ بحیثیت مجموعی خاندانی نظام اور معاشرے کی عمومی صحت کی کیا کیفیت ہے؟ اسلام نے عائلی زندگی اور معاشرت کے بارے میں جو اخلاقی اور قانونی ہدایات دی ہیں' ان کا فہم و ادراک اور ان پر عمل کی کیا کیفیت ہے؟ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اور شریعت' اس کے احکام اور ان کی روح کی پاسداری کے باب میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ معاشرہ اسلام سے مطابقت اور ہم آہنگی کی طرف جا رہا ہے یا انحراف اور بغاوت کی سمت؟ ان حالات میں مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کی کیا ذمہ داری ہے؟ والدین' اساتذہ' علما' ارباب صحافت' سیاسی

قیادت، غرض ہم میں سے ہر ایک کا کیا رول ہے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہمیں دعوت عمل نہیں دے رہا کہ جب کچھ لوگ کشتی کے نچلے حصے میں سوراخ کر رہے ہوں تو کشتی کے دوسرے لوگوں کو خاموش اور بے نیاز نہیں رہنا چاہیے ـــــ "اب اگر وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں تو اسے بھی بچاتے ہیں اور خود بھی بچتے ہیں۔ لیکن اگر اسے چھوڑ دیتے ہیں (یعنی کشتی میں سوراخ کرنے دیتے ہیں) تو اسے بھی ہلاک کرتے ہیں اور خود بھی ہلاک ہوتے ہیں" (مشکوٰۃ)۔

ہم پورے شرح صدر کے ساتھ اور مشرق و مغرب کا ذاتی مشاہدہ کرنے کے بعد یہ اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ آج کا مسلم معاشرہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود اپنے اندر بڑا خیر رکھتا ہے اور اخلاق اور سماجی استحکام کے اعتبار سے مغرب کے نام نہاد ترقی یافتہ معاشرے کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ بلکہ اس کا اعتراف نہ کرنا کفران نعمت کے مترادف ہو گا۔ جن لوگوں کی نگاہ مغربی تہذیب اور اس کے جلو میں آنے والی اخلاقی تباہی، خاندانی نظام کی زبوں حالی، عصمت و عفت کی تحقیر و تذلیل اور بے حیائی اور بے وفائی کی توقیر، بچوں کی کس مپرسی، بے باپ گھرانوں کی بہتات، طلاق کی فراوانی اور ان کے جلو میں رونما ہونے والے طوفان پر ہے۔ وہ پکار رہے ہیں کہ ؎

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انسان کے لیے اس کا ثمر موت

نوبل پرائز یافتہ فرانسیسی سائنس دان ایلکسس کاریل (Alexis Carrel) اقبال کا ہم نوا ہو کر اپنی کتاب "انسان نامعلوم" (Man the Unknown) میں کہتا ہے:

"ہم جائز و ناجائز کی تمیز کھو چکے ہیں، ہم نے قوانین طبیعت کی خلاف ورزی کر کے ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے جس کا مرتکب سزا پائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب بھی کوئی شخص زندگی سے ناجائز امر کی اجازت لیتا ہے، زندگی اس کے جواب میں اسے کمزور بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب روبہ زوال ہے"۔

لیکن کیا ستم ہے کہ آج اس روبہ زوال مغربی تہذیب و ثقافت کے تاریک سائے ہمارے نظام معاشرت و تمدن پر بڑھتے جا رہے ہیں اور ہماری بنیادی اقدار اور روایات بھی ان کی زد میں ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اسلام کی حقیقی تعلیمات سے ناواقفیت اور اس حقیقت سے اغماض ہے کہ ہمارا اپنا معاشرہ حقیقی اسلامی معاشرہ نہیں بلکہ ایک ایسا مخلوط معاشرہ ہے جس میں اسلامی تعلیمات اور روایات کے ساتھ برصغیر کی ہندو جاہلی تہذیب کی بہت سی روایات مل جل گئی ہیں۔ اسلام کے احکامات اور تعلیمات کے کچھ اجزا ضرور ہماری روایت کا حصہ ہیں لیکن اس کے بہت سے دوسرے نہایت اہم اجزا ہم نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ترک کر دیے ہیں اور شریعت کے مقاصد اور اس کے اصل مشن اور روح سے ہم بے پروا ہو گئے ہیں۔ اس سب پر مستزاد مغربی افکار و اقدار کے اثرات ہیں جو ہماری معاشرت کا شیرازہ منتشر کرنے پر تلے ہو رہے

ہیں۔ اور یہ تباہی صرف مغرب کی فکری یلغار اور میڈیا کے سامراجی حملوں ہی کے ذریعہ نہیں آ رہی بلکہ ہم ہی میں سے کچھ عناصر اس ثقافتی امپریلزم کے کارندوں اور اس دور کے میر جعفر اور میر صادق کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو جاہلی اثرات سے بالکل ممیز کیا جائے۔ خاندان اور معاشرت کے حقیقی اسلامی تصور کو اسلامی احکام اور ان کی روح کے مطابق سمجھا اور نافذ کیا جائے۔ مغرب کی نقالی سے احتراز کیا جائے اور خالص اسلامی بنیادوں پر فرد اور معاشرے کی تعلیم اور تشکیل نو ہو۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم اسلام کی تمام برکتوں سے فیض یاب ہو سکیں گے اور وقت کے چیلنج کا جواب دینے کے لائق بن سکیں گے۔

اسلامی معاشرے کی بنیاد مسلمان فرد اور مسلمان خاندان ہے۔ اسلام نے انسانی اجتماعیت کے دونوں بڑے مسائل ـــــ مرد اور عورت کا رشتہ اور فرد اور اجتماع کا تعلق ـــــ کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا ہے۔ دور جدید ہی کے نہیں انسانی تاریخ کے بڑے بڑے تہذیبی فتنے انھی دونوں رشتوں میں بگاڑ، افراط و تفریط اور کمزوری اور انتشار کے پیدا کردہ ہیں۔

اسلام نے اپنی دعوت کا اولیں مخاطب فرد کو بنایا ہے اور اس کے قلب و نظر کو ایمان کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ ہر فرد کی سیرت سازی اس کا پہلا ہدف ہے۔ ہر مرد اور عورت کو ایک اسلامی شخصیت سے آراستہ کر کے ہی اسلام معاشرتی اور تہذیبی انقلاب برپا کرتا ہے۔ فرد کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اسلام اس کا رشتہ معاشرے سے جوڑتا ہے اور اس کے لیے ایسے ادارے قائم کرتا ہے جو زندگی میں استحکام پیدا کر سکیں اور تمام انسانوں کی قوت و صلاحیت کو تعمیر و ترقی کے لیے استعمال کر سکیں۔ اسلامی اجتماعیت میں فرد اور معاشرہ اور ریاست کے درمیان تعلق کشمکش اور محض حقوق کی جنگ سے عبارت نہیں بلکہ اس کی اصل تعاون اور تکافل کا رشتہ ہے۔ شریعت کی روشنی میں دونوں کے رول متعین ہیں اور دونوں ایک ہی مقصد ـــــ یعنی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مصروف کار ہیں۔

اس طرح مرد اور عورت کا رشتہ بھی الہامی ہدایت کے تحت استوار کیا گیا ہے۔ خاندان کا نظام محض انسانی تجربے کا حاصل اور ٹھوکریں کھانے کے بعد کسی موہوم معاشی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہیں (جیسا کہ مارکس، اینجلز اور دارخائم نے اپنے اپنے انداز میں کہا ہے) بلکہ یہ پہلا انسانی ادارہ ہے جسے وحی کے تحت قائم کیا گیا اور جس سے انسانی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اللہ کی شریعت نے اس ادارے کے مقاصد اور خطوط کار متعین کر دیے ہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا پودا تناور اور پھل دار درخت اس بیج کی پیداوار ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے: وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذاریات ۵۱:۴۹) "اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا

کیے ہیں"۔ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ (الشوریٰ ۴۲:۱۱) "اللہ نے تمہارے لیے خود تمھی میں سے جوڑے بنائے اور جانوروں میں سے بھی جوڑے بنائے۔ اس طریقے سے وہ تم کو روئے زمین پر پھیلاتا ہے"۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء ۴:۱) "اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیے"۔ یہاں زوجی رشتے اور تناسل کے تخلیقی عمل کے تعلق کو واضح کر کے خالق کائنات نے اس ادارے کی ایک ابدی حکمت کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے۔ دوسری آیات میں خاندان کے دوسرے وظیفے یعنی محبت' مودت اور سکینت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم ۳۰:۲۱) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی"۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا: هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (اعراف ۷:۱۸۹) "وہی ہے جس نے تم کو تن واحد سے پیدا کیا اور اس کے لیے خود اسی کی جنس سے ایک جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے"۔

اسلام نے خاندان کے نظام کو جو تقدس عطا کیا ہے وہ منفرد ہے۔ یہ محض انسان کی تلاش و جستجو اور تجربے سے حاصل ہونے والا ادارہ نہیں بلکہ اللہ کا قائم کردہ نظام ہے جو انسان کی فطرت کا تقاضا ہے اور معاشرے اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس الہامی طور پر قائم ہونے والے ادارے کے بارے میں ساری ضروری ہدایات خود اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں فراہم کر دی گئی ہیں۔ قرآن پاک میں جو قانونی احکام ہیں ان کا دو تہائی صرف خاندان کے مسائل کے بارے میں ہے اور مسلم معاشرے کو آج تک اسلام کی بنیاد پر قائم رکھنے اور ہر انحراف کے بعد اصل کی طرف رجوع کی تحریک پیدا کرنے والے عوامل میں سب سے اہم قرآن و سنت کی موجودگی کے بعد خاندان ہی کا ادارہ ہے جو ہمارا اصل قلعہ اور مامن رہا ہے' جس کے حصار میں اس امت نے بڑے سے بڑے فتنے کے مقابلے میں پناہ لی ہے اور جس سے وہ انسان رونما ہوتے رہے ہیں جن کے ہاتھوں تجدید و احیا کی نئی تاریخ رقم ہوئی ہے۔ مسلمان خاندان اور خصوصیت سے مسلمان ماں وہ اہم ترین جائے پناہ رہی ہے جس نے اس امت کو راہ ثواب پر قائم رکھا ہے اور ہر پستی کے بعد نئی بلندی کی راہیں ہموار ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دشمن انھی چیزوں کو خاص نشانہ بنا رہا ہے یعنی وحی اور الہامی ہدایت (قرآن و سنت) اور خاندان کا نظام۔ اس کا ہدف مسلمان عورت کو اس کے دین سے برگشتہ کرنا ہے۔ یو این او کے عالمی پروگراموں سے لے کر غیر ملکی اور ملکی این جی اوز اس مقدس جہاد میں مصروف ہیں۔

اسلام میں خاندان کے نظام کا اپنا مخصوص مزاج اور متعین نظام ہے۔ اسے انسانی تہذیبوں کے دوسرے نمونوں (models) سے کنفیوز نہیں کیا جانا چاہیے۔ خواہ ہندو مذہب اور سماج میں پروان چڑھنے والا تصور خاندان ہو، یا یونان، روم اور کلیسا کے دور کا خاندانی نظام یا صنعتی انقلاب اور مغربی اقدار کے زیر اثر رونما ہونے والا مختصر بلکہ منتشر خاندان کا یورپی اور امریکی نمونہ۔۔۔ ان سب کے مقابلے میں اسلام نے خاندان کا جو تصور دیا ہے وہ بالکل مختلف اور منفرد ہے۔ اسے تاریخ کے پدری (patriarchal) نظام یا مغربی ممالک کی نشات ثانیہ کے زیر اثر آزاد محبت رانی (romantic love) دونوں سے کوئی نسبت نہیں۔ اس لیے اس امر کی ضرورت ہے اسلام کے خاندانی نظام کی حقیقت اور اس کی روح کو اچھی طرح سمجھا جائے اور نئی نسلوں میں اس کی صحیح تفہیم پیدا کی جائے۔

اسلام میں نکاح محض شہوت کی تسکین کا ایک راستہ نہیں گو جنسی عمل اور فطرت کے حقیقی تقاضوں کی جائز تسکین اس کا ایک حصہ ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ایک نئے خاندان کے قیام کا ذریعہ، دو خاندانوں میں نئے روابط کی ایک صورت، اور معاشرے کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے اور استوار رکھنے کا ایک تخلیقی عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناجائز سے بچنے اور جائز ذریعے سے شہوت کی تسکین کو بھی لائق اجر عمل قرار دیا گیا ہے۔ نکاح کی حیثیت ایک سنت اور کچھ حالات میں سنت موکدہ کی ہے اور اس نئے خاندان کے قیام کے عمل کو محض وقتی جذبات پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کے لیے بڑے واضح اصول اور ضوابط مقرر کیے گئے ہیں اور ایسے تحفظات کا اہتمام کیا گیا ہے جو اس عمل کو محض ایک کھیل اور تجربہ نہ بننے دیں۔

اسلام نے اپنے پورے عائلی نظام کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی ہے وہ یہ ہیں:

(۱) اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، انسان کی خدائی کی جگہ رب العالمین کی حاکمیت کو تسلیم کرنا اور بندگی اور اطاعت کے راستے کو خوش دلی سے اور والہانہ انداز میں اختیار کرنا۔

(۲) اللہ کی حاکمیت کے عقیدے کا لازمی نتیجہ انسانوں کی مساوات اور برابری، حقوق و فرائض کی پاسداری اور ایک ہی مقصد اور منزل کی جستجو میں رفاقت اور ہم سفری کا احساس اور تجربہ ہے۔ یہ تمام انسانوں کو، مرد اور عورت کو شوہر اور بیوی کو، والدین اور اولاد کو بزرگوں اور بچوں کو، غرض معاشرے کے ہر فرد کو ایک دوسرے سے ایک نئے رشتہ میں جوڑ دیتا ہے اور زندگی گزارنے کے ایک نئے اسلوب اور آہنگ سے روشناس کرتا ہے جسے قرآن نے بڑے حسین انداز میں کامیابی کے معیار کی صورت میں پیش کیا ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ...... اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (الاحزاب ۳۳:۳۵) بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزے رکھنے والے ہیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر

رکھا ہے"۔

دنیا اور آخرت میں برتری اور کامیابی کا معیار نہ جنس (gender) ہے، نہ نسب، نہ دولت اور نہ اقتدار ــــ مرد اور عورت سب کے لیے صرف تقویٰ ہی واحد معیار ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) "لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔

اور پھر سورہ توبہ میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا رفیق اور مددگار بتایا اور دونوں کے لیے کارگہ حیات میں ذمہ داریاں متعین کیں اور دنیا اور آخرت میں اصل کامیابی کا ایک ہی راستہ اور ایک ہی معیار اس دو ٹوک انداز میں مقرر فرما دیا: وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ...... إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (التوبہ ۹:۷۱) "ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں، وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان پر اللہ ضرور رحم فرمائے گا۔ بلاشبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے"۔

مسلم خاندان اور مسلم معاشرہ زندگی اور کامیابی کے اسی انقلابی اصول پر قائم ہوتا ہے اور یہ مسلم امت کو ان تمام گمراہ کن بحثوں سے نجات دے دیتا ہے جن میں دور غلامی سے لے کر مادر پدر آزادی تک کے انسانی سماج میں وہ الجھا رہا ہے۔ اسلام نے زندگی گزارنے کے لیے جو میدان کار (matrix) ہمارے لیے بتایا ہے وہ سب سے جدا اور سب سے نرالا ہے۔

(۳) اسلام کے عائلی نظام کی تیسری بنیاد مہر و محبت اور صلہ رحمی ہے۔ نکاح دراصل اخلاق اور عصمت کے تحفظ کے لیے قلعے کی مانند ہے اور اس قلعے کے مکین ایک دوسرے کے لیے تسکین، محبت اور رحمت کا سرچشمہ ہیں۔ لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم ۳۰:۲۱) اور اس رشتے کو ایک دوسرے کے لباس کے قریبی رشتے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ (البقرۃ ۲:۱۸۷) اور پھر اس رحمت اور محبت کو ازواج یا اولاد تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ صلہ رحمی کے حکم کے ذریعے وسیع تر خاندان اور تمام دوسرے رشتہ داروں کو بھی اس کی ٹھنڈک اور مٹھاس میں شریک کر لیا گیا ہے۔

(۴) اللہ کی حاکمیت، اس کے تحت رونما ہونے والی مساوات اور شرکت مقاصد، عصمت کی حفاظت اور محبت اور رحمت کے بعد چوتھی بنیاد عدل و انصاف ہے۔ اسلام میں کوئی کسی کی ملک نہیں اور کوئی کسی کا تابع مہمل نہیں۔ سب حقوق و فرائض کے ایک الہامی اور منصفانہ نظام کے پابند ہیں۔ اور اگر ایک طرف

اختیارات اور ذمہ داریوں کی تقسیم اور خاندانی نظام کے کامیاب نظم کی خاطر مرد کو بجا طور پر "ایک درجہ فوقیت" دی گئی ہے تو دوسری طرف یہ اختیار بھی قانون کے تابع اور جواب دہی کے نظام سے مشروط ہے۔ جبر اور من مانی کا اختیار (arbitrary power) شریعت الٰہی کے نظام میں کسی کو حاصل نہیں' مرد کو نہ عورت کو!

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ ۲:۲۲۸) "عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے"۔

ہر فرد اپنے اعمال کا ذمہ دار اور ان کے لیے جواب دہ ہے۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (النساء ۴:۱۲۴) "اور جو نیک عمل کرے گا' خواہ مرد ہو یا عورت' بشرطے کہ ہو وہ مومن' تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی"۔

اختیارات' ذمہ داریوں اور جواب دہی کے اس نظام کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے: "تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہو گی۔ امام' نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہو گی' آدمی اپنے اہل پر نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں بازپرس ہو گی اور عورت اپنے گھر کی نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق بازپرس ہو گی" (بخاری)۔

اس پس منظر میں آیت کریمہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ نے الٰہی قانون کے تحت منظم اور مرتب ہونے والے اس ادارے کے مزاج اور طرز کار کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ جس طرح اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ ایک شورائی ریاست اور شورائی معاشرہ ہیں' اس طرح اسلام میں خاندان بھی ایک شورائی ادارہ ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیہ کریمہ کی تشریح و تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اسلامی طرز زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے' گھر کے معاملات ہوں تو میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انھیں بھی شریک مشورہ کیا جائے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو ان میں کنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے"۔ (تفہیم القرآن' جلد ۴' صفحہ ۵۰۹)

(۵) عدل و انصاف اور مشاورت کے اس نظام کو مستحکم کرنے کے لیے مسلمان خاندان کی پانچویں بنیاد فرد کی معاشی آزادی اور اجتماعی تکافل کا ایک ایسا نظام ہے جو مرد اور عورت کی عزت نفس اور آزادی کی مکمل ضمانت کے ساتھ ان کے درمیان تعاون اور شراکت کا رشتہ استوار کرتا ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی ملک پر

پورا اختیار دیتا ہے' مرد کو نان نفقہ کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور عورت کو محض دودھ پلانے والی اور جبری طور پر گھر کا کام کاج کرنے والی نہیں بناتا' بلکہ ان تمام معاملات کو ان کی اہمیت اور خاندانی نظام کی ضرورت کے مطابق حقوق کی باہم پاس داری کے ساتھ انجام دلانا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ گھر کے اندر بھی اور خاندان اور معاشرے کے وسیع تر میدان میں ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے کہ جو بھی مالی اعتبار سے مضبوط ہو' وہ مالی اعتبار سے کمزوروں کی مدد' ان کے ایک حق کی ادائیگی کے جذبہ سے کرے۔ یہ عمل زندگی اور موت دونوں صورتوں میں جاری رہے' یعنی نفقہ' صدقات' صلہ رحمی' وراثت' ولایت' اور نفقہ لا قارب کے قوانین اور ہدایات کی روشنی میں۔

مسلم خاندان کی ان امتیازی خصوصیات پر اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام دوسری تہذیبوں اور سماجوں میں پائے جانے والے خاندانی نظام سے بہت مختلف ہے۔ یہ ایک دینی اور شرعی ادارہ ہے' اس کی حد بندی اور کارکردگی خود الٰہی ہدایت کی روشنی میں اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے کی جاتی ہے۔ یہ عصمت و عفت کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ ہے۔ یہ انسانی فطرت کے تقاضوں کی تسکین اور تکمیل کے لیے ایک موزوں اور دلکش انتظام ہے' یہ نئی نسلوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بہترین گہوارہ ہے۔ یہ جسم اور روح کو محبت' مودت اور سکینت سے شاد کام کرنے اور اس پاکیزہ فضا میں نئی نسلوں کو پروان چڑھانے اور اپنے دین' تہذیب اور تمدن اور انسانی معاشرے کے علوم و فیوض سے روشناس کرانے کا ایک نظام ہے' یہ معاشی تکافل اور سوشل سیکورٹی کا ایک فطری نظام ہے جس میں عزت نفس کی مکمل پاسداری کے ساتھ خاندان کے افراد ایک دوسرے کے لیے سہارا بنتے ہیں اور سب کو معاشی دوڑ میں شرکت اور وسائل سے استفادے کا موقع دیتے ہیں۔ خاندان کا یہ نظام سیرت کے نکھار' معاشرتی استحکام اور تہذیبی ترقی کا اہم ذریعہ ہے۔

ملت اسلامیہ کا اصل مشن ایسے خاندانی نظام کا قیام اور استحکام ہے جو ان اصولوں کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ آج جس بگاڑ سے ہم دوچار ہیں وہ اچانک رونما نہیں ہوا اور محض کسی ایک سبب کی بنا پر پیدا نہیں ہوا' خرابی کی اصل جڑ دین کے علم کی کمی' اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور تعلیمات سے عدم واقفیت اور عملی غفلت' مقصد زندگی کے شعور کی کمی' جاہلی افکار کا غلبہ' موثر قیادت کا فقدان' معاشی ذمہ داریوں سے اغماض' دور غلامی کے اثرات اور مغربی ثقافت کے زیر اثر حالات کا مزید بگاڑ' مفاد پرستی' محض معاشی اور مادی ترقی کے بتوں کی پوجا' علما' مشائخ' اساتذہ' والدین اور میڈیا کا اپنے اصل فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی اور بہت سے غلط اثرات کے فروغ کا ذریعہ بن جانے' معاشرے میں اچھی مثالوں کی کمی---
یہ ہیں وہ چند موٹے موٹے اسباب جن کی وجہ سے یہ صورت حال رونما ہوئی ہے اور اصلاح کا راستہ بھی یہی

ہے کہ ہم اپنی انفرادی اجتماعی ترجیحات کو درست کریں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کی طرف خلوص اور یکسوئی کے ساتھ مراجعت کریں۔ اس وقت تو حال یہ ہے کہ ہم متضاد اور متناقض سمتوں کی طرف لپک رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں!!

ہم میں سے ہر شخص کو ان حالات پر بڑی سنجیدگی اور دل سوزی سے غور کرنا چاہیے اور بحیثیت فرد اور من حیث القوم یکسو ہو جانا چاہیے کہ ہمیں کہاں جانا ہے؟ ہماری منزل کیا ہے؟ کسی فرد اور کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے کسی اور بالآخر تباہی کا راستہ کیا ہو گا کہ اس کا حال یہ ہو جائے کہ ۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے' نہ پا ہے رکاب میں

اگر ہماری منزل اسلام ہے تو پھر دو رنگی اور تضاد عملی کو ترک کرنا ہو گا۔ ایمان اور جہل ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اسلام تو علم کی روشنی میں زندگی گزارنے کا راستہ ہے۔ کیا تعجب ہے کہ مسلمان معاشرے کی اکثریت کو دین کی بنیادی تعلیمات سے بھی آگہی نہیں۔ نئی نسلوں کو اسلامی آداب اور شعائر سے آشنا نہیں کیا جا رہا۔ میڈیا ایک دوسری ہی تہذیب اور ثقافت کا پرچارک ہے جو مسلسل ذہنوں کو مسموم اور اخلاق اور معاشرت کو انتشار کا شکار کر رہا ہے۔ بااثر افراد کا ایک گروہ ہے جو بڑے منظم طریقے پر نوجوانوں کو بے راہ روی اور اباحت پسندی کی طرف لے جا رہا ہے اور ہمارے علما' دانش ور اور ارباب سیاست اپنے اپنے ذاتی' گروہی' مسلکی اور سیاسی مفادات کی جنگ میں مصروف ہیں۔ عدالتیں' برطانوی قانونی روایت کے تتبع میں قانون کے الفاظ کو انصاف کے حصول پر فوقیت دے رہی ہیں۔ جن معاملات کو گھر کی چار دیواری اور خاندان کے حصار میں طے ہونا چاہیے ان کو تھانے اور کچہری کی نذر کیا جا رہا ہے۔ سارے گندے کپڑے سرعام دھوئے جا رہے ہیں اور صحافت تشہیر فحش کی "مقدس خدمت" انجام دیتے ہوئے اس گندگی کو ملک کے طول و عرض میں پھیلانے کا کردار ادا کر رہی ہے۔ علما اور سیاست دانوں کو فرصت ہی نہیں کہ ان معاشرتی ناسوروں کے علاج کی فکر کریں۔

ان حالات میں ملک کے تمام سوچنے سمجھنے والے عناصر اور جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ ملک و ملت کے حقیقی مسائل کی طرف توجہ دیں۔ سیاست محض نعروں کا نام نہیں' سیاست تو تدبیر منزل سے عبارت ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ایک گروہ اصلاح کے لیے عملاً میدان میں اتر جائے۔ تعلیم اور خیر و شر میں تمیز کے احساس کو بڑے پیمانے پر پیدا کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بلاشبہ حکومت کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے لیکن اگر حکومت اپنی اس ذمہ داری کو ادا نہیں کر رہی تو کیا حالات کو تباہی کی طرف

جانے کے لیے چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس کشتی میں تو ہم سب ہی بیٹھے ہیں۔ اس کو بچانے کی ذمہ داری بھی ہم سب کی ہے۔ اگر دوسرے اس میں چھید کر رہے ہیں تو ہم ان سب کو ڈبونے کا موقع کیسے دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی ذمہ داری تحریک اسلامی اور معاشرے کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کی ہے۔

ہماری پہلی ضرورت منزل کے صحیح تعین اور اس کے حصول کے لیے یکسو ہو کر جدوجہد کرنے کی ہے۔ مغربی ثقافت کی نقالی اور تہذیب نو کی یلغار کے آگے سپر ڈالنا ہمارے لیے موت کے مترادف ہے۔ جو کش مکش آج برپا ہے اور جس کا ایک ادنیٰ سا عکس حالیہ عدالتی فیصلے اور اس کے تحت رونما ہونے والی بحثوں میں دیکھا جا سکتا ہے' وہ ہمیں دعوت غور و فکر ہی نہیں' دعوت عمل و جہاد بھی دیتی ہے۔ آیئے سب سے پہلے اپنی منزل کے بارے میں یکسو ہو جائیں۔ اگر وہ 'اسلام ہے' اور اسلام کے سوا کوئی دوسرا راستہ زندگی کا راستہ ہو ہی نہیں سکتا' تو پھر بیک وقت دو مختلف سمتوں میں جانے والی کشتیوں میں سواری کرنے کا احمقانہ ہی نہیں خطرناک راستہ ہمیں ترک کرنا ہو گا۔ فرد کی ذاتی تربیت سے لے کر خاندان کے نظام کی تشکیل' معاشرے کا سدھار' معیشت کی تنظیم نو' صحافت' سیاست' قانون اور عدالت کے نظام کی اصلاح اس کا لازمی حصہ ہیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور مہلت بہت کم ہے۔ ہم ملک کے اہل نظر کو دعوت دیتے ہیں کہ ان بنیادی مسائل کے بارے میں عوام کی موثر رہنمائی کریں۔ ناخوش گوار واقعات پر سے صرف کبیدہ خاطر ہو کر گزر نہ جائیں بلکہ اصلاح کے لیے عملی اقدام کریں۔

یہ ہاتھ

یہ پاؤں

یہ آنکھیں

یہ کان

یہ زبان

یہ قامت راست

یہ عقل و شعور

یہ فکر و خیال

یہ قوت ایجاد

یہ قوت استدلال

یہ صناعی کی صلاحیت

یہ کاری گری کی اہلیت

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ !

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ !!

اے انسان، کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم
کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔

(بندہ خدا)

پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے!

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۔ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ
الْخٰلِقُوْنَ ۔ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۔ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ
اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا
تَذَكَّرُوْنَ ۔ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۔ لَوْ نَشَآءُ
لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۔ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۔ اَفَرَءَيْتُمُ
الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۔ لَوْ نَشَآءُ
جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۔ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ
شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۔ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۔ فَسَبِّحْ
بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۔ (الواقعہ ۵۶: ۵۷-۷۴)

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۔ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۔ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۔ (۵۷-۵۹)

"ہم نے تمھیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ کبھی تم نے غور کیا' یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو' اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟"

دنیا کی تمام دوسری چیزوں کو چھوڑ کر انسان اگر صرف اسی ایک بات پر غور کرے کہ وہ خود کس طرح پیدا ہوا ہے تو اسے نہ قرآن کی تعلیم توحید میں کوئی شک رہ سکتا ہے نہ اس کی تعلیم آخرت میں۔ انسان آخر اسی طرح تو پیدا ہوتا ہے کہ مرد اپنا نطفہ عورت کے رحم تک پہنچا دیتا ہے۔ مگر کیا اس نطفے میں بچہ پیدا کرنے کی' اور لازماً انسان ہی کا بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت آپ سے آپ پیدا ہو گئی ہے؟ یا انسان نے خود پیدا کی ہے؟ یا خدا کے سوا کسی اور نے پیدا کر دی ہے؟ اور کیا یہ مرد کے' عورت کے' یا دنیا کی کسی طاقت کے

اختیار میں ہے کہ اس نطفے سے حمل کا استقرار کرا دے؟ پھر استقرار حمل سے وضعِ حمل تک ماں کے پیٹ میں بچے کی درجہ بدرجہ تخلیق و پرورش، اور ہر بچے کی الگ صورت گری، اور ہر بچے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک خاص تناسب کے ساتھ رکھنا جس سے وہ ایک خاص شخصیت کا انسان بن کر اٹھے، کیا یہ سب کچھ ایک خدا کے سوا کسی اور کا کام ہے؟ کیا اس میں کسی اور کا ذرّہ برابر بھی کوئی دخل ہے؟ کیا یہ کام ماں باپ خود کرتے ہیں؟ یا کوئی ڈاکٹر کرتا ہے؟ یا وہ انبیا اور اولیا کرتے ہیں جو خود اسی طرح پیدا ہوئے ہیں؟ یا سورج اور چاند اور تارے کرتے ہیں جو خود ایک قانون کے غلام ہیں؟ یا وہ فطرت (Nature) کرتی ہے جو بجائے خود کوئی علم، حکمت، ارادہ اور اختیار نہیں رکھتی؟ پھر کیا یہ فیصلہ کرنا بھی خدا کے سوا کسی کے اختیار میں ہے کہ بچہ لڑکی ہو یا لڑکا؟ خوب صورت ہو یا بدصورت؟ طاقتور ہو یا کمزور؟ اندھا بہرا لنگڑا لُولا ہو یا صحیح الاعضاء؟ ذہین ہو یا کُند ذہن؟ پھر کیا خدا کے سوا کوئی اور یہ طے کرتا ہے کہ قوموں کی تاریخ میں کس وقت کس قوم کے اندر کن اچھی یا بُری صلاحیتوں کے آدمی پیدا کرے جو اُسے عروج پر لے جائیں یا زوال کی طرف دھکیل دیں؟ اگر کوئی شخص ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا نہ ہو تو وہ خود محسوس کرے گا کہ شرک یا دہریّت کی بنیاد پر اِن سوالات کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اِن کا معقول جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان پورا کا پورا خدا کا ساختہ و پرداختہ ہے اور جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے ساختہ و پرداختہ اِس انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اپنے خالق کے مقابلے میں آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے؟ اس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی بجالائے؟

توحید کی طرح یہ سوال آخرت کے معاملے میں بھی فیصلہ کُن ہے۔ انسان کی تخلیق ایک ایسے کیڑے سے ہوتی ہے جو طاقتور خوردبین کے بغیر نظر تک نہیں آ سکتا۔ یہ کیڑا عورت کے جسم کی تاریکیوں میں کسی وقت اُس نسوانی انڈے سے جا ملتا ہے جو اسی کی طرح ایک حقیر سا خوردبینی وجود ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک چھوٹا سا زندہ خَلیہّ بن جاتا ہے جو حیات انسانی کا نقطہ آغاز ہے، اور یہ خَلیہّ بھی اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ خوردبین کے بغیر اس کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس ذرا سے خَلیےّ کو ترقی دے کر اللہ تعالیٰ ۹ مہینے چند روز کے اندر رحمِ مادر میں ایک جیتا جاگتا انسان بنا دیتا ہے، اور جب اس کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو ماں کا جسم خود ہی اسے دھکیل کر دنیا میں اُودھم مچانے کے لیے باہر پھینک دیتا ہے۔ تمام انسان اسی طرح دنیا میں آئے ہیں اور شب و روز اپنے ہی جیسے انسانوں کی پیدائش کا یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد صرف ایک عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ جو خدا اس طرح انسانوں کو آج پیدا کر رہا ہے وہ کل کسی وقت اپنے ہی پیدا کیے ہوئے اِن انسانوں کو دوبارہ کسی اور طرح پیدا نہ کر سکے گا۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۔ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ

وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (۶۰-۶۱)

"ہم نے تمھارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے' اور ہم اِس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمھیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے"۔

تمھاری پیدائش کی طرح تمھاری موت بھی ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم یہ طے کرتے ہیں کہ کس کو ماں کے پیٹ ہی میں مر جانا ہے' اور کسے پیدا ہوتے ہی مر جانا ہے' اور کسے کس عمر تک پہنچ کر مرنا ہے۔ جس کی موت کا جو وقت ہم نے مقدر کر دیا ہے اس سے پہلے دنیا کی کوئی طاقت اسے مار نہیں سکتی' اور اس کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔ مرنے والے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کی آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں' بلکہ ڈاکٹر خود بھی اپنے وقت پر مر جاتے ہیں۔ کبھی کوئی نہ موت کے وقت کو جان سکا ہے' نہ آتی ہوئی موت کو روک سکا ہے' نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ کس کی موت کس ذریعے سے' کہاں' کس طرح واقع ہونے والی ہے۔

جس طرح ہم اِس سے عاجز نہ تھے کہ تمھیں تمھاری موجودہ شکل و ہیئت میں پیدا کریں' اُسی طرح ہم اِس سے بھی عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری تخلیق کا طریقہ بدل کر کسی اور شکل و ہیئت میں' کچھ دوسری صفات و خصوصیات کے ساتھ تم کو پیدا کریں۔ آج تم کو ہم اِس طرح پیدا کرتے ہیں کہ تمھارا نطفہ قرار پاتا ہے اور تم ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ بن کر ایک بچے کی صورت میں بر آمد ہوتے ہو۔ یہ طریقِ تخلیق بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا ہے۔ مگر ہمارے پاس بس یہی ایک لگا بندھا طریقہ نہیں ہے جس کے سوا ہم کوئی اور طریقہ نہ جانتے ہوں' یا نہ عمل میں لا سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم تمھیں اُسی عمر کے انسان کی شکل میں پیدا کر سکتے ہیں جس عمر میں تم مرے تھے۔ آج تمھاری بینائی' سماعت اور دوسرے حواس کا پیمانہ ہم نے کچھ اور رکھا ہے۔ مگر ہمارے پاس انسان کے لیے بس یہی ایک پیمانہ نہیں ہے جسے ہم بدل نہ سکتے ہوں۔ قیامت کے روز ہم اُسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دیں گے یہاں تک کہ تم وہ کچھ دیکھ اور سُن سکو گے جو یہاں نہیں دیکھ سکتے اور نہیں سن سکتے۔ آج تمھاری کھال اور تمھارے ہاتھ پاؤں اور تمھاری آنکھوں میں کوئی گویائی نہیں ہے۔ مگر زبان کو بولنے کی طاقت ہم ہی نے تو دی ہے۔ ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ قیامت کے روز تمھارا ہر عضو اور تمھارے جسم کی کھال کا ہر ٹکڑا ہمارے حکم سے بولنے لگے۔ آج تم ایک خاص عمر تک ہی جیتے ہو اور اس کے بعد مر جاتے ہو۔ یہ تمھارا جینا اور مرنا بھی ہمارے ہی مقرر کردہ ایک قانون کے تحت ہوتا ہے۔ کل ہم ایک دوسرا قانون تمھاری زندگی کے لیے بنا سکتے ہیں جس کے تحت تمھیں کبھی موت نہ آئے۔ آج تم ایک خاص حد تک ہی عذاب برداشت کر سکتے ہو' جس سے زائد عذاب اگر تمھیں دیا جائے تو تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضابطہ بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ کل ہم تمھارے لیے ایک دوسرا ضابطہ بنا سکتے ہیں جس کے

تحت تم ایسا عذاب ایسی طویل مدت تک بھگت سکو گے جس کا تم تصور تک نہیں کر سکتے' اور کسی سخت سے سخت عذاب سے بھی تمھیں موت نہ آئے گی۔ آج تم سوچ نہیں سکتے کہ کوئی بوڑھا جوان ہو جائے' کبھی بیمار نہ ہو' کبھی اس پر بڑھاپا نہ آئے اور ہمیشہ ہمیشہ وہ ایک ہی عمر کا جوان رہے۔ مگر یہاں جوانی پر بڑھاپا ہمارے بنائے ہوئے قوانینِ حیات ہی کے مطابق تو آتا ہے۔ کل ہم تمھاری زندگی کے لیے کچھ دوسرے قوانین بنا سکتے ہیں جن کے مطابق جنت میں جاتے ہی ہر بوڑھا جوان ہو جائے اور اس کی جوانی و تندرستی لازوال ہو۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ (۶۲)

"اپنی پہلی پیدائش کو تم جانتے ہو' پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟"

تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ پہلے تم کیسے پیدا کیے گئے تھے۔ کس طرح باپ کی صُلب سے وہ نطفہ منتقل ہوا جس سے تم وجود میں آئے۔ کس طرح رحمِ مادر میں' جو قبر سے کچھ کم تاریک نہ تھا' تمھیں پرورش کر کے زندہ انسان بنایا گیا۔ کس طرح ایک ذرۂ بے مقدار کو نشوونما دے کر یہ دل و دماغ' یہ آنکھ کان اور یہ ہاتھ پاؤں اس میں پیدا کیے گئے اور عقل و شعور' علم و حکمت' صنعت و ایجاد اور تدبیر و تسخیر کی یہ حیرت انگیز صلاحیتیں اس کو عطا کی گئیں۔ کیا یہ معجزہ مُردوں کو دوبارہ جِلا اٹھانے سے کچھ کم عجیب ہے؟ اس عجیب معجزے کو جب تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور خود اس کی زندہ شہادت کے طور پر دنیا میں موجود ہو تو کیوں اس سے یہ سبق نہیں لیتے کہ جس خدا کی قدرت سے یہ معجزہ شب و روز رونما ہو رہا ہے اسی کی قدرت سے زندگی بعد موت اور حشرونشر اور جنت و دوزخ کا معجزہ بھی رونُما ہو سکتا ہے؟

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ۔ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ۔ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ۔ (۶۳-۶۷)

"کبھی تم نے سوچا' یہ بیج جو تم بوتے ہو' ان سے کھیتیاں تم اُگاتے ہو یا ان کے اُگانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو ان کھیتیوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو اُلٹی چٹی پڑ گئی' بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں"۔

اُوپر کا سوال لوگوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساختہ و پرداختہ ہو اور اسی کی تخلیق سے وجود میں آئے ہو۔ اب یہ دوسرا سوال اُنھیں اس دوسری اہم حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ جس رزق پر تم پلتے ہو وہ بھی اللہ ہی تمھارے لیے پیدا کرتا ہے۔ جس طرح تمھاری پیدائش میں انسانی کوشش کا دخل اِس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ تمھارا باپ تمھاری ماں کے اندر نطفہ ڈال دے' اسی طرح تمھارے رزق کی پیداوار میں بھی انسان کی کوشش کا دخل اِس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے کہ کسان کھیتی

میں بیج ڈال دے۔ زمین' جس میں یہ کاشت کی جاتی ہے' تمھاری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اِس زمین کو روئیدگی کی صلاحیت تم نے نہیں بخشی ہے۔ اِس میں وہ مادے جن سے تمھاری غذا کا سامان بہم پہنچتا ہے' تم نے فراہم نہیں کیے ہیں۔ اِس کے اندر جو بیج تم ڈالتے ہو' اُن کو نشوونما کے قابل تم نے نہیں بنایا ہے۔ ان بیجوں میں یہ صلاحیت کہ ہر بیج سے اُسی نوع کا درخت پھوٹے جس کا وہ بیج ہے' تم نے پیدا نہیں کی ہے۔ اس کاشت کو لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کرنے کے لیے زمین کے اندر جس عمل اور زمین کے اوپر جس ہوا' پانی' حرارت' بُرودت اور موسمی کیفیت کی ضرورت ہے' ان میں سے کوئی چیز بھی تمھاری کسی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اللہ ہی کی قدرت اور اسی کی پروردگاری کا کرشمہ ہے۔ پھر جب تم وجود میں اُسی کے لانے سے آئے ہو' اور اسی کے رزق سے پَل رہے ہو' تم کو اُس کے مقابلے میں خود مختاری کا' یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کا حق آخر کیسے پہنچتا ہے؟

اس آیت کا ظاہر استدلال تو توحید کے حق میں ہے' مگر اس میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے' اس پر اگر آدمی تھوڑا سا مزید غور کرے تو اِسی کے اندر آخرت کی دلیل بھی مل جاتی ہے۔ جو بیج زمین میں بویا جاتا ہے وہ بجائے خود مُردہ ہوتا ہے' مگر زمین کی قبر میں جب کسان اُس کو دفن کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے اندر وہ نباتی زندگی پیدا کر دیتا ہے جس سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں شانِ بہار دکھاتی ہیں۔ یہ بے شمار مُردے ہماری آنکھوں کے سامنے آئے دن قبروں سے جی جی کر اُٹھ رہے ہیں۔ یہ معجزہ کیا کچھ کم عجیب ہے کہ کوئی شخص اُس دوسرے عجیب معجزے کو ناممکن قرار دے جس کی خبر قرآن ہمیں دے رہا ہے' یعنی انسانوں کی زندگی بعد موت۔

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ۔ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ۔ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ۔ (۶۸-۷۰)

"کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا' یہ پانی جو تم پیتے ہو' اِسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اِس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اِسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں' پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟"

تمھاری بھوک مٹانے ہی کا نہیں' تمھاری پیاس بجھانے کا انتظام بھی ہمارا ہی کیا ہوا ہے۔ یہ پانی جو تمھاری زندگی کے لیے روٹی سے بھی زیادہ ضروری ہے' تمھارا اپنا فراہم کیا ہوا نہیں ہے بلکہ اِسے ہم فراہم کرتے ہیں۔ زمین میں یہ سمندر ہم نے پیدا کیے ہیں۔ ہمارے سورج کی گرمی سے ان کا پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے۔ ہم نے اُس پانی میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ ایک خاص درجۂ حرارت پر وہ بھاپ میں تبدیل ہو جائے۔ ہماری ہوائیں اسے لے کر اٹھتی ہیں۔ ہماری قدرت اور حکمت سے وہ بھاپ جمع ہو کر بادل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمارے حکم سے یہ بادل ایک خاص تناسب سے تقسیم ہو کر زمین کے مختلف خِطوں پر پھیلتے

ہیں تاکہ جس خِطۂ زمین کے لیے پانی کا جو حصہ مقرر کیا گیا ہے وہ اس کو پہنچ جائے۔ اور ہم بالائی فضا میں وہ برُودت پیدا کرتے ہیں جس سے یہ بھاپ پھر سے پانی میں تبدیل ہوتی ہے۔ ہم تمھیں صرف وجود میں لا کر ہی نہیں رہ گئے ہیں بلکہ تمھاری پرورش کے یہ سارے انتظامات بھی ہم کر رہے ہیں جن کے بغیر تم جی نہیں سکتے۔ پھر ہماری تخلیق سے وجود میں آکر' ہمارا رزق کھا کر اور ہمارا پانی پی کر یہ حق تمھیں کہاں سے حاصل ہو گیا کہ ہمارے مقابلے میں خود مختار بنو' یا ہمارے سوا کسی اور کی بندگی بجالاؤ؟

(یہاں) اللہ کی قدرت و حکمت کے ایک اہم کرشمے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو حیرت انگیز خواص رکھے ہیں' ان میں سے ایک خاصّہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر خواہ کتنی ہی چیزیں تحلیل ہو جائیں' جب وہ حرارت کے اثر سے بھاپ میں تبدیل ہوتا ہے تو ساری آمیزشیں نیچے چھوڑ دیتا ہے اور صرف اپنے اصل آبی اجزا کو لے کر ہوا میں اڑتا ہے۔ یہ خاصیت اگر اس میں نہ ہوتی تو بھاپ میں تبدیل ہوتے وقت بھی وہ سب چیزیں اس میں شامل رہتیں جو پانی ہونے کی حالت میں اس کے اندر تحلیل شدہ تھیں۔ اس صورت میں سمندر سے جو بھاپیں اٹھتیں' ان میں سمندر کا نمک بھی شامل ہوتا اور ان کی بارش تمام روے زمین کو زمینِ شور بنا دیتی۔ نہ انسان اُس پانی کو پی کر جی سکتا تھا' نہ کسی قسم کی نباتات اس سے اُگ سکتی تھی۔ اب کیا کوئی شخص دماغ میں ذرا سی عقل رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اندھی بہری فطرت سے خود بخود پانی میں یہ حکیمانہ خاصیت پیدا ہو گئی ہے؟ یہ خاصیت' جس کی بدولت کھاری سمندروں سے صاف ستھرا میٹھا پانی کشید ہو کر بارش کی شکل میں برستا ہے اور پھر دریاؤں' نہروں' چشموں اور کنوؤں کی شکل میں آب رسانی و آب پاشی کی خدمت انجام دیتا ہے' اِس بات کی صریح شہادت فراہم کرتی ہے کہ ودیعت کرنے والے نے پانی میں اِس کو خوب سوچ سمجھ کر بالارادہ اِس مقصد کے لیے ودیعت کیا ہے کہ وہ اُس کی پیدا کردہ مخلوقات کی پرورش کا ذریعہ بن سکے۔ جو مخلوق کھاری پانی سے پرورش پا سکتی تھی وہ اس نے سمندر میں پیدا کی اور وہاں وہ خوب جی رہی ہے۔ مگر جس مخلوق کو اس نے خشکی اور ہوا میں پیدا کیا تھا اس کی پرورش کے لیے میٹھا پانی درکار تھا اور اس کی فراہمی کے لیے بارش کا انتظام کرنے سے پہلے اس نے پانی کے اندر یہ خاصیت رکھ دی کہ گرمی سے بھاپ بنتے وقت وہ کوئی ایسی چیز لے کر نہ اڑے جو اس کے اندر تحلیل ہو گئی ہو۔

(اب) کیوں یہ کفرانِ نعمت کرتے ہو کہ تم میں سے کوئی اِس بارش کو دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتا ہے' اور کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ سمندر سے بادلوں کا اٹھنا اور پھر آسمان سے پانی بن کر برسنا ایک فطری چکر ہے جو آپ سے آپ چلے جا رہا ہے' اور کوئی اسے خدا کی رحمت سمجھتا بھی ہے تو اُس خدا کا اپنے اوپر یہ حق نہیں مانتا کہ اُسی کے آگے سرِاطاعت جھکائے؟ خدا کی اتنی بڑی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہو اور پھر جواب میں کفرو

شرک اور فسق و نافرمانی کرتے ہو؟

اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۔ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۔ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ۔ (۷۱-۷۳)

"کبھی تم نے خیال کیا، یہ آگ جو تم سُلگاتے ہو، اِس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے، یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لیے سامانِ زیست بنایا ہے"۔

اِس آگ کو یاد دہانی کا ذریعہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو ہر وقت روشن ہو کر انسان کو اُس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے۔ اگر آگ نہ ہوتی تو انسان کی زندگی حیوان کی زندگی سے مختلف نہ ہو سکتی۔ آگ ہی سے انسان نے حیوانات کی طرح کچی غذائیں کھانے کے بجائے ان کو پکا کر کھانا شروع کیا اور پھر اس کے لیے صنعت و ایجاد کے نئے نئے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر خدا وہ ذرائع پیدا نہ کرتا جن سے آگ جلائی جا سکے اور وہ آتش پذیر مادّے پیدا نہ کرتا جو آگ سے جل سکیں، تو انسان کی ایجادی صلاحیتوں کا قفل ہی نہ کھلتا۔ مگر انسان یہ بات فراموش کر گیا ہے کہ اُس کا خالق کوئی پروردگارِ حکیم ہے جس نے اُسے ایک طرف انسانی قابلیتیں دے کر پیدا کیا تو دوسری طرف زمین میں وہ سروسامان بھی پیدا کر دیا جس سے اُس کی یہ قابلیتیں رُوبعمل آ سکیں۔ وہ اگر غفلت میں مدہوش نہ ہو تو تنہا ایک آگ ہی اسے یہ یاد دلانے کے لیے کافی ہے کہ یہ کس کے احسانات اور کس کی نعمتیں ہیں جن سے وہ دنیا میں متمتع ہو رہا ہے۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ۔ (۷۴)

"پس اے نبیؐ، اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو"۔

(تفہیم القرآن، جلد ۴، ص ۲۸۴-۲۹۰)

محبت الٰہی کی دعائیں

اللہ کی محبت' اللہ کا سب سے قیمتی عطیہ ہے۔ اس کی محبت ہی سے ایمان کی حقیقت حاصل ہوتی ہے' ایمان کی حلاوت نصیب ہوتی ہے' جنت کی راہ آسان ہوتی ہے۔ یہ قیمتی دولت ہاتھ پھیلا پھیلا کر اللہ سے مانگو' رو کر اور گڑگڑا کر مانگو۔ اس طرح مانگنے سے محبت پیدا بھی ہوتی ہے۔ اور مانگنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے بہتر اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ حضورؐ فرماتے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَحُبَّ کُلِّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُنِیٓ اِلٰی حُبِّکَ

میرے اللہ' میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں (تو مجھ سے محبت کرے اور میں تجھ سے)' اور اس کی محبت جو تجھ سے محبت کرتا ہو' اور ہر اس عمل کی محبت جو مجھے تیری محبت سے قریب کر دے (کہ مجھے وہ کرنا محبوب ہو' اور اسے کرنا میرے لیے آسان)۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیَّ وَاجْعَلْ خَشْیَتَکَ اَخْوَفَ الْاَشْیَاءِ عِنْدِیْ وَاقْطَعْ عَنِّیْ حَاجَاتِ الدُّنْیَا بِالشَّوْقِ اِلٰی لِقَآئِکَ وَاِذَآ اَقْرَرْتَ اَعْیُنَ اَهْلِ الدُّنْیَا مِنْ دُنْیَاهُمْ فَاَقْرِرْ عَیْنِیْ مِنْ عِبَادَتِکَ

میرے اللہ' اپنی محبت میرے لیے ہر چیز کی محبت سے بڑھ کر دے' اور اپنا خوف ہر چیز کے خوف سے زیادہ کر دے' اور دنیا کی ہر طلب پر اپنی ملاقات کا شوق غالب کر دے' اور جب دنیا والوں کی آنکھوں کو ان کی دنیا سے ٹھنڈک اور لذت دے' تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور لذت اپنی بندگی میں رکھ دے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ اُحِبُّکَ بِقَلْبِیْ کُلِّهٖ وَاُرْضِیْکَ بِجُهْدِیْ کُلِّهٖ

میرے اللہ میں پورے کے پورے دل سے ٹوٹ کر تجھ سے محبت کروں' اور سب کوششیں بس تجھے راضی کرنے میں لگا دوں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبِّیْ لَکَ کُلَّهٗ وَسَعْیِیْ کُلَّهٗ فِیْ مَرْضَاتِکَ

میرے اللہ' میری ساری محبت بس اپنے لیے کر دے' اور میری ساری کوشش بس تیری رضا کے لیے ہو۔

فجر سے پہلے' یا سونے سے پہلے' جب سب سوتے ہوں' حمد و صلوٰۃ و سلام کے بعد' صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو کر' ہر تعلق اور محبت سے دل کو فارغ کر کے' جتنی دیر دل لگے۔

مرتبہ: خرم مراد (خیر خواہ)

سستی اور کاہلی

ایک تعارف ' ایک جائزہ

محمد بشیر جمعہ

آپ نے وہ واقعہ ضرور سنا ہو گا کہ ایک بچے نے انسان کی تصویر درست جوڑ کر دنیا کا بگڑا ہوا نقشہ ٹھیک کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو ' اور جس قسم کی بھی اصلاح چاہتا ہو ' اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اپنی اصلاح کرے اور اپنی ذات کی تنظیم کی طرف توجہ دے۔ ہمارے گھروں کا ' ہمارے دفتروں کا ' ہمارے محلوں اور علاقوں کا ' ہمارے معاشرے کا اور زندگی کے جن جن معاملات سے ہمارا تعلق ہے ' وہاں کا نقشہ بگڑا ہوا ہے۔ اس نقشے کی درستی کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسان کی تصویر کو ٹھیک کریں۔ یہ انسان کی تصویر درحقیقت میری اور آپ کی تصویر ہے۔ یہ بکھری پڑی ہے ' اسے جوڑنا ضروری ہے۔ ہم اپنے ماحول کی اصلاح اور حالات کی درستی کی کوشش کرتے ہیں تاکہ نقشہ ٹھیک ہو جائے لیکن ہم کامیاب نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے ' تصویر بکھری ہوئی ہے۔ تصویر اس لیے بکھری ہوئی ہے کہ:

☆ ہمارے ارادے اور عزائم ضعیف ہو چکے ہیں۔ ☆ ہماری طبیعت میں سستی اور کاہلی آ گئی ہے۔ ☆ ہمارے معاملات میں تساہل پیدا ہو گیا ہے۔ ☆ ہم آج کے کام کو کل پر ٹالتے ہیں۔ ☆ ہم "پھر کبھی" کا شکار ہیں۔ ☆ فیصلوں میں اتنی تاخیر ہوتی ہے کہ بس نکل جاتی ہے ' ٹرین چھوٹ جاتی اور فلائٹ بند ہو جاتی ہے۔ ☆ ہم اتنے ڈرپوک ہو گئے ہیں کہ قسمت کامیابی کے دروازے پر دستک دیتی ہے اور ہم اسے کھولتے تک نہیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی میں سستی اور کاہلی آ گئی ہے اور ہم نے "کل" پر بھروسہ کیا ہوا ہے۔

ہمارے دشمن

یہ "تساہل" ' "سست روی" ' "ٹال مٹول" ' "تاخیر" اور "پھر کبھی" ہمارے دشمن ہیں ' ہمارے اور

ہمارے مستقبل کے لیے انتہائی تباہ کن ہیں۔ یہ نشہ آور چیزوں سے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ جو شخص نشہ کرتا ہے وہ معاشرے سے کافی حد تک کٹ جاتا ہے مگر تساہل اور سست روی کا شکار فرد معاشرے میں شامل رہ کر معاشرے کو نقصان پہنچاتا ہے۔

امام عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ (۵۱۱-۵۹۷ھ) نے اپنی کتاب منہاج القاصدین میں توبہ کے باب میں تسویف (آیندہ کرلوں گا) کے بارے میں لکھا ہے:

"آیندہ پر ٹالنے والے بالعموم ہلاک ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک ہی جیسی دو چیزوں میں فرق کر جاتے ہیں۔ آیندہ پر ٹالنے والے کی مثال اس آدمی کی سی ہے جسے ایک درخت اکھاڑنا ہو۔ وہ دیکھے کہ درخت بہت مضبوط ہے' شدید مشقت سے اکھڑے گا' تو وہ کہے کہ میں ایک سال کے بعد اس کو اکھاڑنے کے لیے آؤں گا۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ درخت جتنی مدت باقی رہے گا' مضبوط ہوتا جائے گا اور خود اس کی جتنی عمر گزرتی جائے گی' وہ کمزور ہوتا جائے گا۔ جب وہ طاقتور ہونے کے باوجود درخت کی کمزوری کی حالت میں اسے نہیں اکھاڑ سکتا تو جب وہ کمزور ہو جائے گا اور درخت زیادہ طاقتور' تو پھر اس پر کیسے غالب آسکے گا"۔

تساہل کیا ہے؟

مزاج اور رویے کے باعث اہم چیزوں کو غیر اہم امور کے مقابلے میں موخر کرنے کے عمل کو ہم تساہل یا ٹال مٹول کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے procrastination استعمال ہوتا ہے۔ ہم بعض اہم کاموں کو اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ انھیں کرنے کا موڈ نہیں ہوتا' بعض اوقات اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ انھیں کرنے کے لیے مناسب وقت اور سکون میسر نہیں ہوتا اور بعض اوقات اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ کرنے کے لیے ابھی کافی وقت اور عمر باقی ہے۔ ہم اللہ کی نعمت "وقت" کو رائیگاں کرتے رہتے ہیں۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "جونہی آنے والے دن کی پو پھٹتی ہے تو وہ آواز لگاتا ہے: اے آدم کی اولاد! میں اللہ کی نئی تخلیق ہوں اور تمھارے اعمال کا گواہ' اس لیے مجھ سے جتنا زیادہ زاد راہ لے سکتے ہو لے لو' میں پھر کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا"۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ مومن کو دو دھڑکے لگے رہتے ہیں' ایک اس کا ماضی جس کے بارے میں وہ نہیں جانتا کہ اللہ اس کے کیا نتائج ظاہر کرے گا اور دوسرا اس کا مستقبل جس کے بارے میں وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔ اس لیے آدمی کو اپنی جان کی خاطر اپنی جان کو' آخرت کی خاطر دنیا کو' بڑھاپے سے پہلے جوانی کو اور موت سے پہلے زندگی کو کام میں لانا چاہیے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ٹال مٹول شیطان کا شعار ہے جس کو وہ مسلمانوں کے دلوں میں بٹھاتا ہے۔ امام ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ عمر کے سانسوں میں سے ہر سانس ایک نفیس جوہر ہے جس کا معاوضہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

کل

ہماری زندگی میں "کل" کا لفظ بھی ایک دھوکا ہے جو انسان کو وقت ضائع کرنے کی شرم اور افسوس سے بچاتا رہتا ہے۔ انسان کی زبان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو "کل" کے لفظ کی طرح اتنے گناہوں، اتنی حماقتوں، اتنی وعدہ خلافیوں، اتنی بے جا امیدوں، اتنی غفلتوں، اتنی بے پروائیوں اور اتنی برباد ہونے والی زندگیوں کے لیے جواب دہ ہو۔ کیونکہ اس کی آنے والی "کل" یعنی "فردا" کبھی نہیں آتی۔ وقت ایک دفعہ گزر گیا، مر گیا۔ تو اس کو پڑا رہنے دو۔ اب اس کے ساتھ اور کچھ نہیں کرنا ہے سوائے اس کے کہ اس کی قبر پر آنسو بہاؤ۔ آج کی طرف لوٹ آؤ مگر لوگ اس کی طرف نہیں لوٹتے اور عملاً "فردا" کو کبھی "امروز" نہیں ہونے دیتے۔

داناؤں کے رجسٹروں میں "کل" کا لفظ کہیں نہیں ملتا، البتہ بے وقوفوں کی جنتریوں میں یہ بکثرت مل سکتا ہے۔ یہ تو محض بچوں کا بہلاوا ہے کہ فلاں کھلونا تم کو کل دے دیا جائے گا۔ کل کا لفظ تو ایسے لوگوں کے لیے ہے جو صبح سے شام تک خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں اور شام سے صبح تک خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ کامیابی کی شاہراہ پر بے شمار لاپاہج سسکتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اپنی تمام عمر "کل" کا تعاقب کرتے ہوئے کھو دی اور اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی۔ ہم اسی دھوکے میں ہاتھ پیر دھرے بیٹھے رہے کہ "کل" ہمارے لیے اچھی اچھی نعمتیں اور فائدہ مند اشیا لائے گا مگر وہ تو آتا ہی نہیں۔ اسی طرح "پھر کبھی" ہے، جو کام مکمل ہو سکتا ہے وہ آج کیوں کریں اور آنے والا "کل" خود کام کے لیے سازگار حالات پیدا کرے گا۔ یہ رویہ یقیناً ہم لوگوں کے لیے بحیثیت فرد، بحیثیت قوم اور بحیثیت امت نقصان دہ ہے۔

ہم اہم اور ضروری نوعیت کے کام جن کی تکمیل سے ہمارا ذاتی، معاشی، معاشرتی اور قومی مفاد وابستہ ہے، خواہ مخواہ ملتوی کر لیتے ہیں اور ان کی بجائے ایسے کام کرنے لگتے ہیں جن کی بہت ضرورت نہیں ہوتی۔ بس ہم اس لیے دوسرے کام کرنے لگتے ہیں کہ اس میں لذت ملتی ہے، طبیعت کے تساہل کو عذر فراہم ہو جاتا ہے، اور اپنی ذات کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ مل جاتا ہے۔

امام ابن جوزیؒ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ اگر صفرا کی زیادتی کا مریض سکنجبین پینے کے بجائے سکنجبین بنانے کی ترکیب سیکھنے میں عمر برباد کر دے تو وہ یقیناً دھوکے میں مبتلا ہے۔ آگے فرمایا: "خوش قسمت وہ ہے، جو اپنی اہم ضرورت کو حاصل کرے، دوسری کو چھوڑ دے، عمل کی طرف توجہ کرے اور اسی کو مقصود اصل جانے"۔

تساہل کے اثرات:

تساہل ایک غیر محسوس بیماری ہے اور خوشبودار نشہ ہے۔ اس سے انسان لذت لیتا ہے۔ یہ انفرادی

مرض بھی ہے' معاشرتی بھی اور قومی بھی۔ اس کے اثرات بھی سخت ہیں۔ ذیل میں اس موضوع کے دو ماہرین جین بی برکا اور لینورا ایم یو آن کی کتاب Procrastination سے ان اثرات کی فہرست دی جا رہی ہے۔

ممکنہ خارجی اثرات:

☆اعتماد اور عزت میں کمی' ☆دوستوں اور اہل خاندان کے ساتھ تنازعات' ☆ساتھیوں اور ہم عصر افراد سے اختلاف و ناراضی' ☆افسربالا سے اختلاف و ناراضی' ☆ملازمت کا نقصان یا بے دخلی' ☆سرکاری جرمانے' ☆مالیاتی نقصان' ☆حادثات یا جسمانی تکلیف۔

ممکنہ داخلی اثرات:

☆احساس کمتری' ☆شرمندگی اور پشیمانی' ☆پریشانی' ☆یکسوئی کا نہ ہونا' ☆سرگرمیوں میں شریک نہ ہونا' ☆خود ملامتی' ☆اضطراب' ☆گھٹن' ☆جسمانی تکلیف یا بیماری' ☆تنہائی پسندی۔

جاگتے کو جگانا ہے

ہم تساہل کی اس بیماری کے باعث اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔ نہ آخرت کی تیاری کرتے ہیں اور نہ دنیا بناتے ہیں۔ زندگی میں ناکامی زنجیروں کی طرح پیروں کو جکڑ لیتی ہے اور حسرت اور ملامتیں مستقبل کا سامان بن جاتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سوتے کو جگانا آسان اور جاگتے کو جگانا مشکل ہے۔ ہم اور آپ جاگ رہے ہیں مگر بستر سے اٹھ نہیں رہے۔ ہمیں جاگنا ہے اور مقصد حیات کے حصول کے لیے کام کرنا ہے۔ دنیا میں دو چیزوں کے وقت کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ رات کو نیند کب آئی۔ دوسرے کسی قوم کا زوال کب شروع ہوا۔ یہ اس قوم کو پتا نہیں چلتا البتہ اس کے نقصانات آیندہ نسلوں کو پہنچتے ہیں۔ ہمارے زوال اور انحطاط کی بہت بڑی وجہ یہ تساہل اور کاہلی ہے' نااہلی ہے' عدم توجہی ہے' مقصد کے شعور کی کمی ہے' نتیجہ یہ ہے کہ گھر کے معاملات سے لے کر قومی معاملات تک میں الجھاؤ ہے اور منٹوں کے کام مہینوں میں بھی نہیں ہوتے اور ہم خوار ہو کر رہ گئے ہیں۔

اپنی ذات کا جائزہ لیجیے' پھر اپنے گھر کا' پھر اپنے ادارے' معاشرے' بلدیاتی' صوبائی اور وفاقی حکومت کا' ہر سطح پر آپ کو تساہل اور سست روی کا سامنا ہے۔ یہ قومی بیماری نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ زوال کی علامت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ بیماری اور نشہ ہیروئین اور افیون سے کچھ کم نہیں ہے۔

انتظار مت کیجیے

ذرا اپنا جائزہ لیجیے کہ ماضی میں آپ کتنا وقت صرف فرصت و فراغت کے' اور حالات کی درستی کے

انتظار میں گزارتے رہے ہیں۔ ایک فہرست تو بنائیے کہ آج تک آپ کیا حاصل کرنا چاہتے تھے اور اب تک کیا کچھ حاصل کر چکے ہیں۔ جو حاصل نہیں کر سکے اس کی قابل قبول وجوہات تھیں یا محض اپنی نفس پرستی' سستی' کاہلی اور خوف خدا کی کمی۔ تو پھر آیئے آج ہم اپنے نفس کو غفلت سے پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تھوڑا سخت حساب کتاب کر لیں اور اپنے نفس اور ذہن و جسم کی حرکات و سکنات اور اس کے رجحانات پر کڑی نگاہ رکھیں۔

امام ابن جوزیؒ فرماتے ہیں: "جب بندہ حج کے فریضے سے فارغ ہو جائے تو چاہیے کہ کچھ دیر اپنے دل کو فارغ کرے اور اپنے نفس سے شرائط طے کرے اور کہے: اے نفس! میرے پاس سرمایہ صرف زندگی ہے۔ اگر میرا یہ سرمایہ فنا ہو گیا تو تجارت اور منافع سے مایوسی ہو جائے گی۔ یہ ایک نیا دن ہے جس میں اللہ نے مجھے مہلت دی ہے اور میری موت کو موخر کر کے مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر وہ مجھے دنیا سے اٹھا لیتا تو میں تمنا کرتا کہ زندگی کی کچھ مہلت اور عطا کر دے تاکہ میں کوئی نیک عمل کر لوں۔ تو اے نفس! یہی سمجھ کہ تو فوت ہو چکا ہے اور پھر تجھے واپس کیا گیا ہے۔ اس دن کو ضائع کرنے سے بچ جا اور جان لے کہ دن رات میں چوبیس گھنٹے ہیں اور یوں سمجھ لے کہ بندے کے لیے ہر روز چوبیس الماریاں قطار در قطار رکھی ہیں۔ قیامت کے دن یہ الماریاں کھولی جائیں گی اور اللہ ہر گھنٹے میں کمائی ہوئی نیکیوں کو دیکھے گا۔ اگر یہ نیکیوں کے نور سے بھری ہوں گی تو اسے اتنی خوشی ہو گی کہ اگر وہ دوزخیوں پر تقسیم کی جائے تو حیرانی کی وجہ سے ان کو آگ کی تکلیف کا احساس نہ رہے۔ اگر بدقسمتی سے صورت حال دوسری ہوئی یعنی کوئی شخص نیکیوں کی بجائے برائیوں میں پھنسا رہا' تو نور کی جگہ اندھیرا ہو گا اور تعفن پھیلے گا اور وہ گھنٹہ جس میں اس نے اللہ کی نافرمانی کی ہو گی' اسے عذاب الیم سے ہمکنار کر دے گا۔ اسے اتنی گھبراہٹ اور ذلت محسوس ہو گی کہ اگر وہ تمام جنتیوں پر تقسیم کر دی جائے تو ان کی نعمتیں مکدر ہو جائیں۔

بے عمل لوگوں کے لیے ایک اور خزانہ کھولا جائے گا جو خالی ہو گا۔ نہ اس میں کوئی خوشی کی بات ہو گی' نہ غمی کی۔ یہ وہ گھنٹہ ہو گا جس میں یہ لوگ سوئے رہے تھے (یعنی وقت ضائع کر رہے تھے) ان میں سے ہر شخص اس کے خالی ہونے پر افسوس کرے گا اور اسے ایسا دکھ ہو گا جیسے کہ اس آدمی کو جو بہت سا منافع حاصل کرنے پر قادر تھا لیکن موقع ضائع کر کے اس سے محروم ہو گیا۔

ہر انسان کو چاہیے کہ اپنے نفس سے کہے: "آج کے دن کوشش کر کے ہر الماری کو نیک اعمال سے بھر' ایک کو بھی خالی نہ چھوڑ۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے علیین کے درجات ضائع ہو جائیں اور دوسرے ان کو حاصل کر لیں"۔

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عقل مند وہ

آدمی ہے جو اپنے نفس کو اپنے تابع رکھے اور موت کے بعد کام آنے والے عمل کرے، اور عاجز وہ ہے جو اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے لگ جائے اور اللہ سے بھلائی کی امید رکھے"۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "قیامت کا حساب ہونے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرو اور اعمال کا وزن ہونے سے پہلے ان کو تولو اور بڑی پیشی کے لیے تیاری کرو۔ سورہ حاقہ میں ہے اس دن تم پیش کیے جاؤ گے تم سے کوئی چیز مخفی نہ رہے گی۔ (منہاج القاصدین)

صورتیں اور وجوہات

اپنی زندگی سے سستی اور کاہلی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ تشخیص کریں کہ یہ مرض کن کن صورتوں میں ہمارے معمولات میں داخل ہے۔ جین بی برکا اور لینورا ایم یوآن کی کتاب میں ان کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ یہ فہرست آپ کو اپنی ذات کا جائزہ لینے کا موقع دے گی کہ آپ کن معاملات میں تساہل کا شکار ہیں اور کن معاملات میں مستعد۔ فہرست درج ذیل ہے:

گھریلو امور

○ چھوٹے چھوٹے کام کاج اور مرمت کے کام۔ ○ مزدور اور مستری کو بلانا۔ ○ خراب اور غیر ضروری سامان کی واپسی۔ ○ گھر کے بڑے کام۔ ○ گاڑی کی دیکھ بھال اور مرمت۔ ○ گھریلو ضروریات اور سہولیات کے بلوں کی ادائیگی۔ ○ سازوسامان کی خرید۔ ○ بیوی بچوں کے ضروری کام کاج کرنا۔

دفتری امور

○ دفتر وقت پر پہنچنا۔ ○ میٹنگ کے لیے وقت کی پابندی سے پہنچنا۔ ○ کاروباری فون باقاعدگی سے کرنا۔ ○ فیصلے کرنا۔ ○ کاغذی امور بہتر طریقے سے نمٹانا۔ ○ رپورٹس وغیرہ تحریر کرنا۔ ○ افراد کے مسائل پر گفتگو کرنا۔ ○ اچھی کارکردگی پر افراد کی حوصلہ افزائی کرنا۔ ○ تخلیقی خیالات اور تجاویز کو قابل عمل بنانا۔ ○ اپنے گاہکوں کو اپنی خدمات اور تجارت کے بل بھیجنا۔ ○ اپنے لیے تنخواہ میں اضافہ اور ترقی کے لیے بات کرنا۔ ○ اپنے افسر کے ساتھ، معاملات پر گفتگو کے لیے میٹنگ کرنا۔

اپنی ذات کے لیے

○ جسمانی ورزش کرنا۔ ○ وزن کم کرنے کے طریقے اپنانا۔ ○ سگریٹ یا نشہ آور چیزوں کو ترک کرنا۔ ○ طبی مشورے کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کرنا۔ ○ حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرنا۔ ○ بال بنانا۔ ○ ذاتی دلچسپی کے حوالے سے مطالعہ کرنا۔ ○ مشاغل اور دلچسپی کے امور کو انجام دینے کی کوشش کرنا۔ ○ ذاتی دلچسپی کے معاملے میں مختلف کورسز میں شرکت کرنا۔

سماجی تعلقات

○ دوستوں سے ملاقات کرنا یا فون کرنا۔ ○ خط و کتابت کرنا۔ ○ افراد کو مدعو کرنا۔ ○ رشتے داروں کے ہاں ملاقات کی غرض سے جانا۔ ○ رشتے داروں سے خط و کتابت یا فون پر رابطہ۔ ○ مختلف امور میں ہدیہ تحریک پیش کرنا۔ ○ تحفے اور کارڈز بھیجنا۔ ○ سماجی اور معاشرتی امور کے لیے وقت پر پہنچنا۔ ○ مدد اور استعانت کے لیے درخواست کرنا۔ ○ افراد کو یہ بتانا کہ آپ غصے میں ہیں یا ناراض ہیں۔ ○ غیر مفید تعلقات کو ختم کرنا۔

مالیاتی امور

○ انکم ٹیکس کے گوشوارے تاخیر سے بھرنا۔ ○ آمد و خرچ کا مناسب حساب رکھنا۔ ○ اپنے وسائل کا بجٹ بنانا۔ ○ بچت کی سرمایہ کاری کرنا۔ ○ بنک سے گوشوارے یا دیگر متعلقہ امور کے سلسلے میں رابطہ کرنا۔ ○ مختلف قسم کے بلوں کی ادائیگی۔ ○ مختلف اداروں کے قرضوں کی واپسی۔ ○ ذاتی قرضہ جات کی واپسی۔ ○ مختلف قرض داروں سے رقم جمع کرنا اور یاد دہانی کرانا۔ ○ ریڈیو، ٹی وی، گاڑی اور متعلقہ واجبات ادا کرنا۔ ○ اپنی چیک بک کا جائزہ لینا۔

ان کے علاوہ بھی چند امور ایسے ہیں جن کی ہمارے معاشرے کے تناظر میں بڑی اہمیت ہے:

○ معاملات میں اگر غلطی یا زیادتی ہو جائے تو معافی مانگ لینا۔ ○ رشتے داروں کے ساتھ مختلف تنازعات کو نمٹانا۔ ○ دوستوں اور احباب سے ادھار مانگی ہوئی چیزوں کی واپسی۔ ○ حقوق اللہ کے معاملے میں کوتاہیوں کے سلسلے میں معافی اور توجہ۔ ○ افراد سے تعزیت کرنا۔ ○ مرحومین کے لیے دعاے مغفرت کرنا۔ ○ اپنے معاملات کی سہولت کے لیے دعا کرنا۔ ○ احباب سے کیے گئے وعدے کو ایفا کرنا۔

تساہل کی چند مزید صورتیں

ہماری عمومی زندگی میں تساہل چند مزید صورتوں میں آموجود ہوتا ہے۔ جیسے:

☆ ہمارے عمومی کام اہم کاموں کے آگے آ جاتے ہیں اور ہم ترجیحات کے معاملے میں اپنی ضرورت کا خیال نہیں رکھتے۔

☆ قومی ڈسپلن کی کمی کے باعث انتہائی اہم کاموں سے فرار کے لیے ہمیں ہزاروں بہانے مل جاتے ہیں۔ ہم اپنے فرار اور ناکامی کا بوجھ خارجی وجوہات پر ڈالتے ہیں۔

☆ ہم زندگی کے اپنے مقرر کردہ اہداف تک اپنی اسی قسم کی کوتاہیوں کے باعث نہیں پہنچ سکتے۔ نتیجتاً ہم ذہنی دباؤ کا شکار ہوتے ہیں جس سے ہماری استعداد کار متاثر ہوتی ہے۔

☆ چونکہ ہماری قومی زندگی میں بنیادی فلسفہ' تصور حیات' پالیسی' متعلقہ منصوبہ بندی اور افراد کار کے بہتر استعمال کی صلاحیت کی کمی ہے لہٰذا قومی مزاج ہنگامی اور ایڈہاک ازم کا شکار ہو گیا ہے۔ حکومتیں اور ادارے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اجتماعی قومی نقصان کو نظرانداز کر کے اہم اقدامات کر لیتے ہیں جو ان کے وجود کو تو فوری طور پر برقرار رکھ لیتے ہیں مگر بحیثیت قوم ہم اپنی بنیادوں ہی کو ڈائنامائیٹ کرتے ہیں۔

☆ ہمارا مزاج یہ ہے کہ جس کام کے لیے کوئی آخری تاریخ ہوتی ہے' ہم اسے آخری تاریخ کو ہی کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کئی مواقع ایسے آتے ہیں جن میں اس کام کی نہ صرف منصوبہ بندی بلکہ اصل کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔

☆ ہمارا مزاج اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موسم برسات میں جب پانی جمع ہوتا ہے تو ہم پتھر رکھ کر راستہ بناتے ہیں حالانکہ اس معاملے میں انفرادی اور بلدیاتی کوششیں پہلے بھی ہو سکتی ہیں۔

☆ امتحانات کے دنوں میں وقفہ کرنے کے لیے چند گھنٹے تک فلمیں دیکھ لی جاتی ہیں یا دوستوں کی محفل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ وقت چاہے چند منٹ کا ہی کیوں نہ ہو' بہت قیمتی ہے۔ ہم اخبار پڑھنے لگتے ہیں' ناول پر وقت گزار لیتے ہیں۔ اتوار کے دن گھر کے سودا سلف کی ضرورت ہوتی ہے مگر اخبارات کو سودا سلف پر ترجیح دیتے ہیں نتیجتاً گھر کے لیے بچی کھچی چیزیں آتی ہیں حالانکہ اخبارات تو سودا سلف کے بعد بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔

انگور کھٹے تھے

ہم تساہل کے معاملے میں اپنے آپ کو مندرجہ ذیل عذرات سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ انسان عموماً اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لینے کے باوجود اپنے آپ کو پھر بھی حق پر سمجھتا ہے۔

"کام کرنے کے لیے مناسب سازوسامان نہیں ہے۔ تحریری کام تو عموماً نیلے رنگ کی روشنائی سے کرتے ہیں۔ میرے پاس تو سیاہ رنگ کی تھی اس لیے کام نہیں ہو سکا"۔

"منی بس میں تو جانوروں کی طرح بٹھاتے ہیں جب کہ رکشہ ٹیکسی کی ہڑتال تھی اس لیے کام نہیں ہو سکا"۔

"کافی دیر سے کام کر رہا ہوں بس اب آرام کی ضرورت ہے"۔

"قوت محرکہ کی ضرورت ہے' اس کے بغیر کام نہیں کر سکتا"۔

"یہ تو ہفتے کے آخری ایام ہیں اب اس ہفتے میں کام کی ابتدا کا کیا فائدہ!"

"پوچھا کیوں جائے حالانکہ جواب تو ہمیں پتا ہے "نہ" ہی میں ہو گا"۔

دو چھوٹے سے واقعات ہیں جن سے تساہل سے گریز کرنے والے ذمے دار افراد کا کردار سامنے آتا ہے۔

○ دفتر میں شام کے اوقات میں اچانک ٹیلی فون کا ایک پیغام تحریر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ وہ صاحب پنسل یا قلم ڈھونڈتے رہے۔ نہیں ملی۔ اب وہ پیغام سن کر یادداشت کے ذریعے دوسرے روز کہہ سکتے ہیں مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ٹائپسٹ کی میز پر کاربن پڑا ہوا تھا۔ ردی کی ٹوکری سے کاغذ اٹھایا اور ماچس کی تیلی سے کاربن پر تحریر کیا جس کا اثر کاغذ پر آگیا۔ درحقیقت یہ ذہانت، احساس ذمہ داری اور تساہل سے گریز کی علامت ہے۔

○ ایک صاحب اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہوئے۔ دوسرے روز صبح سویرے اخبار والے نے دروازے پر دستک دی: "آپ اخبار لیں گے"۔ ان صاحب نے اخبار والے سے پوچھا: "آپ کو پتا کیسے چلا کہ ہم رہنے کے لیے آگئے ہیں"۔ جواب دیا: "آپ کی بالکنی میں کپڑے لٹک رہے تھے"۔ ان صاحب کو اس کے اس احساس کی قدر ہوئی اور اخبارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اخبار والا یہ بھی کر سکتا تھا کہ آج تو پہلا ہی دن ہے "کل" پوچھ لیں گے۔ نئے نئے آئے ہیں تھکے ہوئے ہوں گے۔ ایسی صورت میں یقیناً اخبار کا سلسلہ کہیں اور سے شروع ہو جاتا۔

ہمارے یہاں یقیناً اس کردار کی کمی نہیں ہے لیکن ایسا کردار بہت کم ملتا ہے۔ عملی زندگی میں تساہل سے گریز کی چند مزید صورتیں یہ ہیں:

"ممکن ہے کہ کام کے اچھے نتائج نہ ہوں۔ مگر ذمہ داری دی گئی ہے لہٰذا پورا کر لیا جائے۔ کل کا انتظار کیوں کروں۔ آج ہی کر لوں"۔

○ آج تو بہت تھکا ہوا ہوں۔ بس آدھے گھنٹے تک یہ کام کر کے اچھی نیند کر لوں گا۔

○ اوہ! آج تو ٹی وی پر میری پسند کا پروگرام ہے۔ ابھی پندرہ منٹ ہیں۔ پھر پانچ منٹ کے اشتہار۔ چلو ان بیس منٹوں میں یہ چھوٹے چھوٹے کام نمٹا لوں۔

○ کام کے لیے سازوسامان نہیں۔ دیکھیں کسی اور ترکیب سے بھی یہ کام ہو سکتا ہے۔

○ آج تو ہفتے کا آخری دن ہے۔ اب یہ کام اس ہفتے میں تو نہیں ہو تا۔ چلیں ابتدا تو کر لیں۔

وجوہات

ہم تساہل کیوں کرتے ہیں۔ ہمارے اجتماعی مزاج میں تساہل کی وجوہات اور عناصر کے جائزے کی ضرورت ہے۔

○ ہمارے عمومی کام جو کہ بعض وجوہات کی بنا پر فوری نوعیت کے ہو جاتے ہیں جن کے باعث ہمارے اہم کام متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں ترجیحات متعین کرنے کا شعور نہیں ہے۔

○ تساہل کی ایک بہت بڑی وجہ ناکامی کا خوف ہے۔ ہم دوسروں کے سامنے شرمندہ ہونے کے خوف سے

اپنے اہم امور کو ٹالتے ہیں۔ ایسی ہی مثال ہے کہ کسی طالب علم نے یہ سوچ لیا ہو کہ اسے میٹرک کے امتحان میں پہلی پوزیشن لینی ہے۔ بس یہ خوف کہ وہ امتحان کی ایسی تیاری نہیں کر سکا لہٰذا پہلی پوزیشن نہیں آ سکتی۔ نتیجتاً وہ امتحان ہی نہ دے۔ یہ خوف تو ہمیں تباہ کر دے گا۔ زندگی تو ایک عظیم مقابلہ ہے جس میں کروڑوں افراد ہم سے بہتر ہیں اور ہم کروڑوں افراد سے بہتر ہیں۔ مقابلے سے فرار کیوں اختیار کریں۔ اتنی تو جرات ہونی چاہیے کہ ہم اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں۔ کامیاب فرد کو مبارکباد دے دیں۔ پھر اتنا حوصلہ بھی ہونا چاہیے کہ ہم اپنی غلطیوں کا جائزہ لیں اور صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں۔

○ اپنے بارے میں بہت اعلیٰ تصور قائم کر لینا اور کام اس لحاظ سے ملتوی کرنا کہ اس تصور سے اس کا تناسب نہیں۔

○ اپنے آپ کو فرشتہ صفت انسان سمجھنا اور غلطیوں سے مبرا محسوس کرنا۔ بغیر غلطیوں کے کام کرنے کا عزم رکھنا۔ اس صورت میں تو پھر آپ کوئی بھی کام نہیں کر سکیں گے۔

○ ہم ہر کام خود کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ناگزیر ہیں۔ جب تک کام خود نہیں کریں گے، کام نہیں ہو گا۔ یہ تصور غلط ہے۔ ہمیں اپنے ماتحت افراد کو تیار کرنا ہو گا۔ ہم اپنے اداروں کے معاملے میں اداروں اور اپنے ساتھیوں کے مقروض ہیں۔ تربیت ہی یہ قرض ادا کرا سکتی ہے۔

○ غصہ اور ناراضگی کا اظہار پشیمانی پیدا کرتا ہے۔ پھر ہم احساس ندامت کے باعث کم از کم اس دن اور اس فرد کے لیے کام کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔

○ صلاحیتوں کی کمی بھی تساہل پیدا کرتی ہے۔ اپنی صلاحیتوں اور ادارے کی ضروریات میں توازن ہونا چاہیے۔

○ جب پہیہ ایجاد ہو چکا ہے تو اس سے فائدہ اٹھایئے۔ اپنے طور پر اس پہیے کو بنانے کے لیے تحقیق میں وقت صرف مت کیجیے۔ جو کام ہو چکے ہیں انھیں رد مت کیجیے بلکہ بھرپور فائدہ اٹھایئے۔

○ تساہل کی بہت بڑی وجہ جس کا شعور ہو جائے تو ہم اس عادت کا علاج بھی کر سکیں گے۔ وہ زندگی کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شعور، وقت ہی کو زندگی سمجھنا اور اس معاملے میں خوف خدا رکھنا اور آخرت میں جواب دہی کا احساس رکھنا کہ یقیناً ہم سے، ہمارے وقت کا، ہماری صلاحیتوں کا، ہمارے مال و دولت کا، ہمارے اہل و عیال کا ضرور سوال ہو گا۔ اس احساس کے ساتھ دیکھیے زندگی کتنی آسان ہو جاتی ہے۔ (جاری)

قانون سازی کے قرآنی اصول

ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی

۶۔ اباحت

قرآن حکیم کے اصول تشریع میں ایک اور اصول اباحت کا ہے۔ یعنی کون سی چیزیں حلال ہیں اور کون سی حرام۔ قرآن حکیم نے حلت و حرمت کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے یہ اصول دیا ہے کہ وہ اشیا حلال ہیں جو انسانوں کے لیے مطلقاً نفع بخش ہیں یا ان کا نفع ان کے نقصان سے زیادہ ہے یا ان کا فائدہ انسانیت کے بڑے طبقے کو پہنچتا ہے' البتہ حلت و حرمت کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس لیے انسانی قانون سازی میں عقل کی کم مائیگی' خواہشات کی در اندازی کے اثرات اس قدر غالب ہوتے ہیں کہ قانون حلت و حرمت کو اگر انسانی قانون سازی کے سپرد کر دیا جاتا تو یہ بااثر طبقوں کے ہاتھوں میں زیر اثر افراد و طبقات کے استحصال کا ایک بہت بڑا ہتھیار ہوتا۔ اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ: وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (المومنون ۲۳:۷۱) اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان اور ان کے درمیان سب کچھ تباہ ہو جائے۔

اسی لیے قرآن حکیم نے حلت و حرمت کے اختیار کا قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (النحل ۱۶:۱۱۶) "اور یونہی جھوٹ جو تمھاری زبان پر آ جائے مت کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے لگو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں ان کا بھلا نہیں ہو گا"۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جاہلیت میں لوگ حلت و حرمت کے خود ساختہ قوانین پر عمل کرتے تھے تاآنکہ اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا' اپنی کتاب اتاری۔ انھوں نے کتاب اللہ کے حلال کو حلال اور کتاب اللہ کے حرام کو حرام ٹھہرایا۔ جس چیز کو قرآن نے حلال کیا' وہ حلال ہے اور جسے حرام ٹھہرایا وہ حرام ہے۔ جس کے بارے میں خاموشی اختیار کی اس کے بارے میں معافی اور رخصت ہے۔

اپنی طرف سے حلال کو حرام یا حرام کو حلال قرار دینا شرک کے مترادف ہے۔ قرآن حکیم نے اہل کتاب کے بعض افعال پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

انھوں نے اپنے علما اور مشائخ اور مسیح بن مریم کو اللہ کے سوا رب (Lords) بنا لیا حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں' اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ عدی بن حاتم نے جو پہلے نصرانی تھے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ آیت سنی تو کہنے لگے: عیسائی ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا' درست ہے لیکن ان علما و مشائخ نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا اور عام عیسائیوں نے ان کی پیروی کی' یہی تو ان کی عبادت تھی۔ (ترمذی)

قرآن حکیم نے مشرکین کے اس طرز عمل کو ایک اور مقام پر ہدف تنقید بنایا ہے' ارشاد ربانی ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (یونس ۱۰:۵۹)

"کہہ دیجیے مجھے بتاؤ' جو رزق اللہ نے تمھارے لیے اتارا اس میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال قرار دے دیتے ہو۔ کہہ دیجیے کیا اللہ نے تمھیں اس کا اختیار دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہو"۔

قرآن حکیم اور احادیث نبویہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اباحت کا تعلق صرف اشیا سے ہی نہیں ہے بلکہ تمام افعال و تصرفات بھی مباح ہیں بشرطیکہ ان کا تعلق عبادت سے نہ ہو اور ان کے حرام ہونے کے بارے میں تصریح نہ آئی ہو۔ ارشاد ربانی ہے: قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (الانعام ۶:۱۱۹)

"جو چیزیں اس نے تمھارے لیے حرام کی ہیں وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں"۔

البتہ عبادت کے بارے میں اصول مختلف ہے اور کسی بھی کام کو اپنے طور پر عبادت قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ اسے مباح کہا جا سکتا ہے تاوقتیکہ شارع کی طرف سے نص صریح موجود نہ ہو۔

انھی آیات و احادیث کی وجہ سے ائمہ فقہ اپنے علم' بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کے باوجود فتویٰ دینے سے گریز کرتے تھے اور ایک دوسرے کی طرف مراجعت کرنے کو کہتے تھے۔ مبادا حلت و حرمت کے مسائل میں ان سے غلطی سرزد ہو جائے۔

امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام احمد بن حنبل اور امام ابن تیمیہ سے اسی طرح کی روایات ہیں۔ اس سے مجتہدین فقہا کے ورع' تقویٰ' خوف و خشیت کا اندازہ ہوتا ہے (یوسف القرضاوی ۲۱-۲۷)

قرآن حکیم نے حلت و حُرمت کے بارے میں جو احکام بیان کیے ہیں ان کی روشنی میں قرآن حکیم کا

حلال و حرام کا فلسفہ بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآنی احکام کا خلاصہ یہ ہے: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ ۲:۲۹) "زمین میں جو کچھ ہے اللہ نے تمھارے نفع کے لیے پیدا کیا"۔

ایک اور مقام پر قرآن حکیم نے حرام امور گنواتے ہوئے شرک' والدین سے بد سلوکی' قتل اولاد' بے حیائی اور فحاشی' بے گناہ کو قتل کرنا' یتیم کے مال پر دست درازی' ناپ تول میں کمی' بے انصافی' وعدہ خلافی اور فرقہ بندی کو حرام قرار دیا ہے (الانعام ۶:۱۵۲-۱۵۴)

قرآن حکیم کا اسلوب یہ بتاتا ہے کہ تمام اشیا اصلاً" مباح ہیں بجز ان چند اشیا کے جن کا کسی نہ کسی طرح کا استعمال منع کر دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی آیت هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ ۲:۲۹) "وہی ذات ہے جس نے پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے تمھارے نفع کے لیے"۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی ہر چیز انسانوں کے نفع کے لیے پیدا کی گئی اور صرف ان اشیا کی نشان دہی کر دی گئی ہے جن سے کسی خاص نوعیت کا انتفاع درست نہیں تھا۔ مثلاً کھانے پینے کی اشیا: مردار' خنزیر' شراب' جوا وغیرہ۔ اسی طرح مناکحات کے بارے میں قرآن حکیم نے ان عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا ہے جن کے ساتھ نکاح میں دینی ضرر ہے' مثلاً وہ مشرکہ ہیں (البقرہ ۲:۲۲۱) یا عزت و آبرو کا نقصان ہے مثلاً وہ بدکار ہیں (النور ۲۴:۳) وہ بہت قریبی رشتہ دار ہیں (النساء ۴: ۲۲-۲۴)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس ضمن میں بہت واضح ہے' آپ نے فرمایا:

"اللہ نے کچھ امور فرض کیے ہیں انھیں ضائع نہ کرو' کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو' کچھ چیزیں حرام کی ہیں ان کی پردہ دری نہ کرو اور تم پر رحم کرتے ہوئے بغیر بھولے کچھ چیزوں کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے ان کے پیچھے نہ پڑو"۔

قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر مختلف اشیا کی حلت و حرمت بیان کرنے کے بعد ایک اصول دے دیا ہے جس کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا۔ قرآن حکیم میں ہے:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ (المائدہ ۵:۴)

"آپ سے پوچھتے ہیں کہ کون کون سی چیزیں ان کے لیے حلال ہیں' کہہ دو کہ سب پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہیں"۔

قرآن حکیم نے نبی اکرمؐ کے منصب نبوت کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے کہا: "وہ نبی امی انھیں معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور گندی چیزیں حرام کرتا ہے۔ (الاعراف ۷:۱۵۷)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کا سب سے اہم پہلو یہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شارع قرار دیا ہے۔ قرآنی تصریحات کے مطابق اللہ نے آپ کو تشریعی اختیارات (legistative powers) عطا کیے۔ امر و نواہی اور تحلیل و تحریم صرف قرآنی آیات میں منحصر نہیں بلکہ وہ چیزیں جنھیں رسول اللہؐ نے حلال یا حرام قرار دیا ہے وہ بھی اسی طرح حلال یا حرام ہوں گی جیسے قرآن کی بیان کردہ چیزیں ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اختیارات درحقیقت اللہ کے دیے ہوئے اختیارات ہیں اور آپ کا دیا ہوا قانون، قانون خداوندی کا حصہ ہے۔ اسلام کے قانون حلت و حرمت کی مزید وضاحت آپؐ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں کی جا سکتی ہے کہ:

"حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح، ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جو مشتبہ چیزوں سے بچتا ہے وہ اپنا دین اور اپنی عزت بچا لیتا ہے اور جو مشتبہ سے احتراز نہیں کرتا حرام کا ارتکاب کر گزرتا ہے، اس چرواہے کی طرح ہے جو اپنا ریوڑ ممنوعہ چراگاہ کے اردگرد چراتا ہے، کسی بھی وقت جانور اس میں منہ مار سکتے ہیں"۔

گویا لسان نبوت نے واضح کر دیا کہ جن اشیا کا نفع واضح ہے وہ حلال محض ہیں اور جن کا نقصان واضح ہے وہ حرام محض ہیں۔

۷۔ ازالہ ضرر

قرآن حکیم کے اصول تشریع میں ایک اہم نکتہ ازالہ ضرر ہے۔ اگرچہ اسے عدم حرج اور قلت تکلیف کے عنوانات کے تحت لایا جا سکتا ہے تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر، جیسا کہ آیندہ سطور سے واضح ہو گا اسے مستقل عنوان دیا گیا۔ ضرر کے درجات کا تعین آسان نہیں ہے البتہ انسانی معاشرہ قدیم ترین عہد سے آج تک اس امر پر متفق ہے کہ اہم ترین ضرر، جن کا ازالہ ہر دور میں قانون کے اولیں مقاصد میں ہوتا ہے، پانچ ہیں:

۱۔ ضرر نفس ۲۔ ضرر مال ۳۔ ضرر عزت ۴۔ ضرر عقل ۵۔ ضرر دین۔

اسلامی شریعت کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے، انھی اقسام ضرر کے ازالے کے مثبت پہلو کو مقاصد شریعہ (objectives of law) کہتے ہیں۔ شاطبی نے مقاصد شریعہ پر بحث کرتے ہوئے پانچ چیزوں کو شریعت کے مقاصد قرار دیا ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ تحفظ نفس ۲۔ تحفظ مال ۳۔ تحفظ عزت ۴۔ تحفظ عقل ۵۔ تحفظ دین۔

اگر مقاصد شریعت کو اسلام کی مقرر کردہ انتہائی سزاؤں کے تناظر میں دیکھا جائے تو سمجھنے میں مزید آسانی ہوتی ہے۔ اسلام نے صرف چند ایک جرائم کی انتہائی سزائیں متعین کی ہیں جنھیں قصاص اور حدود کا نام دیا گیا ہے۔ باقی جرائم کی سزائیں کتاب و سنت نے خود مقرر کرنے کے بجائے قانون سازی کا اختیار افراد امت

کو دیا ہے۔ انسانی زندگی کے خلاف ہونے والا انتہائی جرم' قتل نفس ہے۔ اس لیے اس کی انتہائی سزا قصاص مقرر کی گئی ہے۔ مال کے خلاف انتہائی جرائم چوری اور ڈاکہ ہیں۔ ان کی انتہائی سزائیں ہاتھ کاٹنا' قتل' سولی پر لٹکا دینا' مخالف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹ دینا یا قید کر دینا ہے۔ عزت و آبرو کے خلاف جرائم میں بدکاری اور قذف شامل ہیں۔ بدکاری کی سزا ۱۰۰ کوڑے اور قذف کی ۸۰ کوڑے ہیں۔ عقل کے خلاف جرم کی نوعیت یہ ہے: کسی ایسی نشہ آور چیز کا استعمال جس سے حواس مختل ہو جائیں' عقل پر پردہ پڑ جائے اور نیک و بد کی تمیز ختم ہو جائے۔ اس کے لیے ۸۰ کوڑے سزا مقرر کی گئی ہے اور دین کے خلاف جرم' ارتداد (Apostasy) ہے جس کی سزا موت ہے۔ گویا انتہائی ضرر کے ازالے کے لیے انتہائی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ ذیل میں' مذکورہ بالا پانچ اشیا سے ضرر کے ازالے کے لیے قرآن حکیم نے جو ہدایات دی ہیں ان کی تلخیص پیش کی جاتی ہے:

۱- تحفظ جان

انسانی جان کے تحفظ کے لیے دو طرح کے اہتمام کیے گئے ہیں: ۱- اثباتی ۲- سلبی۔

اثباتی اہتمام میں اولاً تو نسل انسانی کے تحفظ و بقا کے لیے یہ اہتمام کیا گیا کہ اس کائنات کو انسانی زندگی کے لیے ہمہ وجوہ سازگار بنایا گیا ہے اور وہ تمام اسباب و وسائل مہیا کر دیے گئے جو انسانی زندگی کی بقا اور ارتقا کے لیے ضروری تھے۔ خود انسان کے اندر ایسی قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت کر دی گئیں جو اس کے تحفظ اور دوام کے لیے ضروری ہیں۔ مرد اور عورت کی فطری صلاحیتوں میں اختلاف اور ان میں باہمی کشش اور محبت کو نسل انسانی کو پروان چڑھانے کی ضمانت بنا دیا۔

جس وقت سے رحم مادر میں نئے انسانی وجود کی تشکیل شروع ہوتی ہے اسی وقت سے اس کے تحفظ و بقا کا قانون حرکت میں آ جاتا ہے۔ مطلقہ عورت کے بارے میں قرآن حکیم نے کہا ہے کہ: وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق ۶۵:۶) "اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرو تاآنکہ وضع حمل (delivery) ہو جائے"۔

اور ولادت کے بعد اگر: "وہ تمہارے لیے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو اور آپس میں خوشگوار روابط رکھو اور اگر ناموافقت کرنے لگو تو بچے کو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے" (الطلاق ۶۵:۶)۔ حمل اور رضاعت کے دوران نہ صرف کھانا پینا بلکہ مطلقہ کے لباس کی ذمہ داری بھی بچے کے باپ پر ہے۔ (البقرہ ۲:۲۳۳)۔ یہ ذمہ داری اس حد تک ہے کہ مرد کے علم اور اطلاع کے بغیر بچے کی ماں اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریات شوہر کے مال سے لے سکتی ہے اور اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

اگر کسی بچے کا باپ وفات پا جائے اور کفالت کا کوئی انتظام نہ ہو تو قریبی رشتے داروں پر فرض عائد ہو گا

کہ وہ بچے کی کفالت کریں اور اگر دوسرا کوئی انتظام نہ ہو تو حکومت سرکاری خزانے سے کفالت کا انتظام کرے گی لیکن ایک انسانی جان کو کسی قیمت پر ضائع نہیں ہونے دیا جائے گا۔

انسانی جان کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے حلال و حرام کے باب میں قرآن حکیم نے صراحت کی ہے کہ صرف چند اشیا ممنوع کی گئی ہیں اور وہ بھی اس وجہ سے کہ ان کا استعمال انسانی زندگی اور صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ باقی تمام اشیا مباح ہیں تاکہ انسان کو اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ان قوانین سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ انسانی نسل کے تحفظ کی قرآن حکیم نے کس حد تک ضمانت دی ہے اور اس کے لیے آخری حد تک اثباتی اقدام کیے ہیں۔

اب رہا سلبی پہلو تو اس کا تعلق اس امر سے ہے کہ اگر کوئی شخص واقعتاً کسی کو ضرر پہنچاتا ہے تو اس کے لیے ایسی سزا رکھی جائے تاکہ معاشرے سے ضرر رسانی کے رجحان کا قلع قمع ہو سکے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے نسل انسانی کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے قتل ناحق کو بہت بڑا جرم قرار دیا اور اس کے لیے قصاص کا اصول دیا ہے اور یہ بتایا کہ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (البقرہ ۲:۱۷۹) "تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے"۔ اسی طرح اگر انسانی جان کو نقصان پہنچانے کے لیے قتل سے کم درجے کا جرم کیا جاتا ہے تو قرآن حکیم نے یہ قانون دیا ہے کہ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدہ ۵:۴۵) "اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ"۔

انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام نے جنگ کے قواعد و ضوابط مقرر کیے جس کے تحت دشمن ملک کی عام آبادی، غیر فوجیوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں، مذہبی رہنماؤں اور عملی طور پر جنگ میں حصہ نہ لینے والوں کو جان کا تحفظ دیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام عین حالت جنگ میں بھی نسل انسانی کے تحفظ کا ہدف ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

تحفظ مال و ملکیت

قرآن حکیم نے مال کو انسانوں کے لیے وجہ قیام قرار دیا ہے۔ انسان کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے اور جسمانی زندگی کو بقا دینے کے لیے اللہ نے مال پیدا کیا اور فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (النساء ۴:۵) "بے وقوفوں کو اپنے وہ مال نہ دو جنھیں اللہ نے تمھارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے"۔

اسی وجہ سے مال کی محبت اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھ دی ہے۔ نہ صرف ضروریات زندگی کی حد تک بلکہ آسائش اور زیب و زینت کی چیزوں کی محبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اسی فطرت انسان کی تصویر کشی قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کی ہے:

"لوگوں کے لیے ان کی خواہشات کی محبت خوشنما کر دی گئی ہے یعنی عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے

ڈھیر' عمدہ گھوڑے' چوپائے اور کھیتیاں' یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہے"۔ (آل عمران ۳:۱۴)

اس آیت میں زین کا صیغہ مجہول (passive form) اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ ان اشیا کی محبت انسان نے خود اپنے اختیار سے اپنے اندر پیدا نہیں کی بلکہ یہ میلان اور محبت انسان کے خالق نے اس کی طبیعت اور جبلت میں رکھ دی ہے۔ البتہ محبت کے بارے میں عام قاعدہ یہ ہے کہ محبت انسان کی شعوری سوچ کو متاثر کرتی ہے اس لیے یہ انتباہ بھی کر دیا ہے کہ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال ۸:۲۸) " تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے وجہ آزمایش ہے"۔

"اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کے احکام اور اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کے تقاضے پورے کرنے کے مقابلے میں اپنے مال کو ترجیح دیتا ہے اس کا انجام کبھی بخیر نہیں ہو سکتا"۔ (التوبۃ ۹:۲۴)

مال اللہ کی نعمت ہے لیکن یہ عزت کا معیار نہیں ہے۔ (الانفال ۸:۲۶' بنی اسرائیل ۱۷:۶' التوبۃ ۹:۵۵' آل عمران ۳:۱۹۶' الزخرف ۴۳:۳۳۔۳۴) بلکہ مال کی محبت انسان کو ذلت کی انتہا گہرائیوں میں گرا دیتی ہے۔ (الھمزۃ ۱۰۴:۱۔۹)

اسلام میں ملکیت کے تصور کو قرآنی تصریحات کی روشنی میں دیکھا جائے تو سب سے اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ:

کائنات کی کوئی چیز بھی اصلاً" انسان کی ملکیت نہیں ہے۔ ایک حقیر ذرے سے لے کر کائنات کی بڑی سے بڑی چیز تک کسی بھی شے پر انسان کو مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہیں حتیٰ کہ انسان اپنی جان' زندگی اور اعضا بدن کا خود مالک نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کو یہ استحقاق حاصل نہیں کہ اپنی جان تلف کر دے' کسی کو پیشگی اپنا خون معاف کر دے بلکہ اگر کسی شخص کی زمین میں زائد از ضرورت گندم پیدا ہوتی ہے تو اسے یہ حق نہیں کہ اپنی گندم جلا ڈالے' سمندر میں پھینک دے یا کسی اور طریقے سے ضائع کر دے کیونکہ قرآن حکیم کی رو سے انسان کی جان' اعضا و جوارح (life and limbs) قوتیں اور صلاحیتیں' مادی اسباب و وسائل سب کچھ اللہ کی ملکیت ہے اور انسان کے پاس بطور امانت ہے۔

انسان کو مال کے بارے میں جو تصرفات کا اختیار حاصل ہے ان کے لیے قرآن حکیم نے وراثت کا لفظ استعمال کیا ہے: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (الاعراف ۷:۱۲۸) "زمین اللہ کی ہے کہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے"۔

وراثت میں جو سب سے بڑی حقیقت پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ وراثت انسان کو اپنے آبا و اجداد سے ملتی ہے۔ گویا وراثت کا لفظ استعمال کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ وسائل تم سے پہلے کسی اور کے تصرف میں تھے اور تمھارے بعد کسی اور کے تصرف میں ہوں گے۔ تھوڑے دنوں کے لیے تمھیں

حق تصرف دیا گیا ہے تاکہ تمھاری آزمایش ہو جائے کہ تم اسے کس طرح استعمال کرتے ہو۔

حقِ ملکیت میں فرد اور اجتماع کی رعایت

اسلامی قانون ملکیت میں فرد اور اجتماع دونوں کی بھلائی، اصلاح اور خیر خواہی پیش نظر رکھی گئی ہے۔ فرد اور اجتماع کے حقوق میں اس قدر توازن ہے کہ فرد کو مکمل تحفظ دیا گیا ہے بشرطے کہ اس کے حق ملکیت سے معاشرے کو نقصان نہ پہنچے اور معاشرے کو مکمل اختیارات دیے گئے ہیں بشرطے کہ ان کی وجہ سے فرد کے مفادات متاثر نہ ہوں۔ اسلام نے انتہائی جامع الفاظ میں یہ اصول بیان کیا ہے: "اسلام میں نہ اپنا نقصان نہ کسی دوسرے کا" (مسند احمد عن ابن عباس)

امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک گھر والوں سے پانی مانگا۔ انھوں نے پانی نہ دیا اور وہ شخص پیاس سے مرگیا۔ حضرت عمرؓ نے اس شخص کے خون کی ذمہ داری اس گھر پر ڈال کر ان سے اس کی دیت دلائی (ایضاً)۔

اس واقعہ کا دوسرا پہلو دیکھا جائے تو وہ یہ ہے کہ پانی اس گھر کی ملکیت تھا اور مسافر کا پانی میں حق نہیں تھا۔ اہل خانہ کو اپنی ملکیت کے تحفظ اور کسی بھی دوسرے شخص کو اس کے استعمال سے روکنے کا استحقاق تھا لیکن اسلامی قانون: "چھوٹے نقصان کو برداشت کر کے بڑا نقصان دور کیا جائے" اس امر کا متقاضی ہے کہ انتہائی ضرورت کے وقت حق ملکیت کا تقدس ختم کر کے مال غیر میں تصرف کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی قانون ملکیت اراضی میں شفعہ کا جواز اسی اصول پر ہے۔ یحییٰ بن آدم القرشی نے بیان کیا ہے کہ ضحاک بن خلیفہ انصاری کی زمین تھی۔ اس میں پانی پہنچانے کے لیے محمد بن مسلمہ کے باغ سے پانی گزارنا پڑتا تھا اور محمد بن مسلمہ اس کی اجازت نہیں دیتے تھے جس کے نتیجے میں ضحاک کی زمین بنجر ہو رہی تھی۔ معاملہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ نے محمد بن مسلمہ کو بلا کر پوچھا:

کیا اس میں تمھارا کوئی نقصان ہے؟

انھوں نے کہا: نہیں۔

آپ نے فیصلہ سنا دیا: اللہ کی قسم اگر پانی گزارنے کے لیے تمھارے پیٹ کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو تو تمھارے پیٹ پر سے گزار دوں گا (کتاب الخراج)

سمرہ بن جندب کی ایک کھجور ایک انصاری کے احاطے میں تھی۔ حضرت سمرہ اور ان کے اہل خانہ کھجوریں توڑنے آتے تو انصاری کو زحمت ہوتی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو آپ نے سمرہ کو بلا کر کہا کہ کھجور فروخت کر دو، وہ نہ مانے۔ آپ نے فرمایا کاٹ دو، انھوں نے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا: ہبہ کر دو اور اس کا بدلہ جنت میں لے لو، انھوں نے قبول نہ کیا تو آپ نے کہا: تم دانستہ

نقصان پہنچا رہے ہو' اور انصاری کو حکم دیا کہ جاؤ اور اس کی کھجور کاٹ دو۔ (ابوداؤد، کتاب الاقضیہ، ۳:۲۱۵)

تحفظ ملکیت کے اقدامات

انسانی زندگی کی بقا کے لیے مال کی اہمیت کے پیش نظر قرآن حکیم نے تحفظ ملکیت کے قوانین وضع کیے اور ایسے حالات پیدا کرنے کی طرف انسانی معاشرے کی رہنمائی کی جس میں کوئی ایسا طبقہ پیدا نہ ہو جو زبردستی دوسروں کے اسباب معاش اور وسائل رزق پر قبضہ کر کے انھیں بنیادی ضرورتوں یا ضروری آسائشوں سے محروم کر دے۔ ارشاد ربانی ہے: "ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق نہ کھاؤ اور اسے حاکموں تک نہ پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ جان بوجھ کر کھا جاؤ (البقرہ ۲:۱۸۸)

قرآن حکیم نے ربو کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس میں دوسرے کی ضرورت یا مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی رضامندی کے بغیر اس سے مال حاصل کیا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا اور اس طرح کے حالات پیدا کرنا کہ لوگ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے سود پر قرض لینے پر مجبور ہو جائیں، اسلامی نظام سے بغاوت ہے جس کی سنگین سزا سورۃ المائدہ کی آیت حرابہ (المائدۃ ۵:۳۳) میں بیان کی گئی ہے۔

اہل کتاب کے علما و مشائخ کو دوسروں کے مال ناجائز طریقے سے کھانے کی پاداش میں دنیوی اور اخروی سزائیں سنائی گئیں (النساء ۴:۱۶۱، التوبۃ ۹:۳۴)

کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر کھانے کا ایک طریقہ چوری بھی ہے۔ چوری کرنے کی سزا بتاتے ہوئے قرآن حکیم نے کہا ہے:

"چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت جو بھی ہو ان کے ہاتھ کاٹ دو، ان کے عمل کی عبرت ناک سزا ہے اللہ کی طرف سے" (المائدہ ۵:۳۸)

ڈاکے کے ذریعے کسی کے مال کو ہتھیانے کی سزا اس سے بھی سنگین ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑائی کرتے ہیں اور زمین میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا سولی دی جائے، یا ان کے مقابل ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں یا ملک سے نکال دیا جائے، یہ تو ہے ان کی دنیا میں رسوائی اور ان کے لیے آخرت میں برا عذاب ہے (المائدہ ۵:۳۳)۔

تحفظ مال کے سلسلے میں قرآن حکیم نے مزید ہدایات دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو لوگ اپنا دفاع خود نہیں کر سکتے ان کے مال کو دوسروں کی نسبت زیادہ تحفظ فراہم کیا جائے۔ یتامیٰ کے لیے اپنے مال کا تحفظ مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے انؐ کے مال کے تحفظ کے بارے میں سخت احکام ہیں (النساء ۴:۲-۱۰، الانعام ۶:۱۵۲)۔ اور جو شخص اپنے مال کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے (بخاری)

ان احکام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مال کے سلسلے میں لاحق ہونے والے ضرر کے ازالے کے لیے کس قدر جامع قانون سازی کی گئی ہے۔

تحفظ عزت و ناموس

بالعموم انسانی معاشروں میں عزت و ناموس کو زندگی اور مال و دولت پر بھی ترجیح حاصل ہوتی ہے اور افراد معاشرہ عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ قرآن حکیم نے انسانی مقام و منصب کو بہت احترام دیا ہے اور اس کے ابنائے جنس میں سے بھی کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ کوئی ایسا اقدام کرے جس سے کسی دوسرے شخص کی عزت نفس مجروح ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ (الحجرات ۴۹:۱۱) "اے ایمان والو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ نیز فرمایا: "اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور دوسروں کے عیبوں کی ٹوہ میں نہ لگے رہو، تم ایک دوسرے کی برائی پیٹھ پیچھے بیان نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی اسے پسند کرتا ہے کہ اپنے بھائی کا مردہ گوشت کھائے، تم اس سے نفرت کرتے ہو (الحجرات ۴۹:۱۲)

عزت و ناموس کو ضرر پہنچانے والی بدترین چیز بدکاری یا بدکاری کا جھوٹا الزام ہے جس کے نتیجے میں کسی بھی فرد کے، جس کے والدین پر الزام ہو، سلسلہ نسب کی صحت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضرر کو دور کرنے کے لیے قرآن حکیم نے بہت اہتمام کیا ہے۔

۱۔ قرآن حکیم نے مرد اور عورت کے آزادانہ جنسی تعلقات پر پابندی عائد کر کے اسے نکاح کے ساتھ مقید کر دیا ہے تاکہ جس معاشرے میں وہ افراد رہتے ہوں اسے معلوم ہو کہ اس جوڑے کا اکٹھا رہنا قانونی ہے۔ ان کے ہاں پیدا ہونے والی اولاد جائز ہے اور وہ معاشرے میں عزت کے مقام کی مستحق ہے۔

۲۔ قرآن حکیم نے رشتہ ازدواج کو محض قانونی رشتہ قرار نہیں دیا بلکہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے وجہ سکون اور اسے دو خاندانوں کے درمیان باہمی محبت و مودت کا رشتہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھی میں سے تمھارے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس راحت حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان مودت و رحمت کا ذریعہ بنایا۔ (الروم ۳۰:۲۱)

۳۔ میاں بیوی کے باہمی حقوق و فرائض کا اس طرح تعین کیا کہ کسی فریق کو دوسرے سے کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ (البقرہ ۲:۲۲۸)

"بیویوں کے حقوق ہیں اسی طرح جیسے کہ ان کے فرائض ہیں"۔

۴۔ مرد اور عورت فطری اور خلقی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور دونوں اپنی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ چونکہ ان دونوں کے وظائف الگ الگ ہیں اس لیے ان میں تقسیم کار کے اصول کے تحت مرد کو انتظام میں اور عورت کو احترام میں برتری دی گئی۔

"مرد عورتوں کے لیے نگہبان ہیں۔ اس لیے خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا اور اس لیے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں، پس جو نیک بی بیاں ہیں وہ مردوں کا کہا مانتی ہیں، ان کی غیر حاضری میں ان چیزوں کی حفاظت کرتی ہیں جن کی اللہ نے حفاظت کی ہے"۔ (النساء ۴:۳۴)

۵۔ خواتین بالعموم فطرتاً کمزور ہوتی ہیں اور مرد تنوع پسند جس کے نتیجے میں تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ اس لیے خواتین کو بہتر گھریلو ماحول مہیا کرنے کے لیے مردوں کو حکم دیا گیا کہ: "اے ایمان والو! تمھارے لیے جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور انھیں روکے نہ رکھو اس نیت سے کہ جو تم نے انھیں دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لے سکو۔ ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کا ارتکاب کریں تو انھیں گھروں میں روکے رکھنا درست ہے اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو، اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بھلائی پیدا کر دے اور اگر تم ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت کرنا چاہو اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ مت لینا۔ کیا تم بہتان باندھ کر اور کھلے گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے اس سے مال واپس لینا چاہتے ہو۔ اور تم دیا ہوا مال کیسے واپس لے سکتے ہو جب کہ تم ایک دوسرے کے انتہائی قریب رہ چکے ہو اور وہ تم سے پکا وعدہ لے چکی ہیں"۔ (النساء ۴:۱۹-۲۱)

(جاری)

اسلامی تحریکیں اور حزب اختلاف کا کردار

پروفیسر ممتاز احمد
ترجمہ: طیب ابو عادل

اسلامی تحریکیں، مغرب کے غور و فکر کا موضوع ہیں۔ مغربی لٹریچر میں اس کے لیے "سیاسی اسلام" (Political Islam) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ مڈل ایسٹ پالیسی کے جنوری ۹۷ کے شمارے میں مڈل ایسٹ پالیسی کونسل کے زیر اہتمام سینیٹ کے دفتر کی عمارت میں منعقدہ گیارہویں کیپیٹل ہل کانفرنس کی روداد Political Islam: Can it Become A Loyal Opposition کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں ہیمپٹن (Hampton) یونی ورسٹی کے پاکستانی پروفیسر ممتاز احمد کا خطاب اور سوال جواب ایک نقطہ نظر کے طور پر ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

ایک جمہوری حزب اختلاف کا وجود اس بات کا پیشگی تقاضا کرتا ہے کہ جمہوری نظام قائم ہو، جائز اور آئینی حکومت کام کر رہی ہو اور اس بات کا امکان موجود ہو کہ کبھی کسی ایک پارٹی کو اکثریت حاصل ہو، کبھی کسی دوسری پارٹی کو۔ جبی جمائی اور مستقل نوعیت کی اکثریتیں جو مختلف مسلمان ممالک میں حکمران نظر آتی ہیں، نہ ہوں۔ مثلاً شام اور عراق میں پچھلے چالیس سے بھی زیادہ برسوں سے بعث پارٹی کی حکومت ہے، مصر میں عرب سوشلسٹ یونین پینتالیس سال سے حکمران ہے اور صدر سوہارتو کی گولکا پارٹی تیس برس سے انڈونیشیا پر چھائی ہوئی ہے۔

جمہوری حزب اختلاف کا وجود صرف اس صورت میں ممکن ہے جب اس کے لیے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آنے کے امکانات ہوں۔ ایسے امکانات و مواقع کی عدم موجودگی میں کسی جمہوری حزب اختلاف کی توقع عبث ہے۔ اس لیے اسلامی تحریکوں سے ان کی جمہوریت سے وابستگی کے تصدیق نامے اور ثبوت مانگنے سے پہلے ہمیں مشرق وسطی کی حکومتوں سے ان کی جمہوریت پسندی اور جمہوری شہرت کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ مشرق وسطی کے ممالک میں جمہوریت کے پنپنے کے کیا امکانات ہیں؟ یہ حقیقت سب کے علم میں ہے کہ ان معاشروں میں جمہوریت کے مستقبل کا

انحصار اسلامی سیاست کے علم برداروں کے طرز فکر و عمل پر نہیں بلکہ اس بات پر ہو گا کہ مشرق وسطیٰ کی حکومتیں اپنے سیاسی نظاموں کو وسیع تر شرکت اور بار بار کے انتخابات کے لیے کھولنے پر آمادہ ہوں، ایسے انتخابات کے لیے نہیں جیسے مصر میں ہوتے ہیں جہاں عہدہ صدارت کے لیے ایک ہی امیدوار میدان میں ہوتا ہے، انڈونیشیا کی طرز کے انتخاب بھی نہیں جہاں پچھلے تیس برس سے ایک ہی امیدوار مسند اقتدار پر براجمان ہے۔ ان ممالک کے یہ صدور معمول کے مطابق پچانوے فیصد ووٹ حاصل کر لیتے ہیں اور عراق کے صدام حسین تو ان سے دو ہاتھ آگے ہیں اور ۹۹.۹ فیصد ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ اور باقی اسلامی دنیا میں کتنے حکمران ہیں جو جمہوری انتخابات کے ذریعے سے اقتدار میں آئے؟ ان کو کیا حق ہے کہ وہ اسلام پرستوں کو جمہوریت کے لیے خطرہ قرار دیں؟ جیسے کہ ان معاشروں میں سیاسی افق پر اسلام پرستوں کے نمودار ہونے سے پہلے جمہوریت موجود تھی اور اب ان کے آنے سے جمہوریت کے وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ سوہارتو اس وقت اقتدار میں آئے جب تیس برس پہلے میں جامعہ کراچی میں بی۔اے کا طالب علم تھا۔ ان کے سامنے آٹھ امریکی صدر آئے اور آکر چلے گئے۔ قذافی اور حافظ الاسد کی آمد کے وقت میں بیروت کی امریکی یونی ورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ حسنی مبارک پندرہ برس سے مسلسل اقتدار میں ہیں اور جب تک رہ سکیں، رہنے کے لیے منصوبے بنا رہے ہیں۔

ان معاشروں میں عموماً حکومت دو ہی طرح سے بدلتی ہے: حکمران مرجائے یا اسے مار ڈالا جائے۔ ایسے سیاسی نظام میں جمہوری حزب اختلاف کیونکر وجود میں آ سکتی ہے جہاں حکمران عمر بھر کے لیے کرسی اقتدار سے چپک جائیں اور اپوزیشن کے لیے کبھی بھی اقتدار میں آنے کا کوئی راستہ نہ چھوڑیں، جہاں پرامن اختلاف کرنے والوں کو روکا جائے، دھمکایا جائے، جیل بھیجا جائے، تشدد کا نشانہ بنایا جائے، اور انھیں اظہار خیال کے ہر ذریعے سے محروم رکھا جائے۔ ان کے لیے سیاسی اقتدار میں شرکت کے مواقع کا تو ذکر ہی نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ وفاداری کس کی؟ کیا ان غاصب حکمرانوں کی جو سیاسی قتل، فوجی بغاوتوں، موروثی حقوق اور انتخابی ڈراموں کے ذریعے سے حکومت میں آئے ہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ ایسے حکمرانوں کے نہ حزب اختلاف کے سیکولر گروہ وفادار ہو سکتے ہیں نہ اسلامی۔ مروجہ سیاسی نظام سے وفا اس سوال کا دوسرا پہلو ہے۔ جواب پھر نفی میں ہے۔ اس لیے کہ بہت سے مسلمان ممالک میں رائج سیاسی نظام کو ابھی تک اتفاق رائے حاصل نہیں ہوا ہے۔ بعض مقامات پر اسلام پرستوں نے نظام کو قبول کر کے مروجہ قوانین کے مطابق سیاسی عمل میں شرکت کا فیصلہ کیا تو برسرمیدان، دوران کھیل، کھیل کے قواعد بدل دیے گئے۔

مصر، الجزائر اور اردن میں انتخابی قوانین صرف اس لیے بدل دیے گئے کہ اسلام پرستوں کا راستہ روکا جا

سکے۔ اسلام پرستوں نے ۱۹۷۱ میں انڈونیشیا کے پہلے پارلیمانی انتخابات میں ۹۰ نشستیں حاصل کر لیں۔ اس پر قوانین میں یہ تبدیلی عمل میں لائی گئی کہ آیندہ پارلیمانی ارکان کی ۳۳ فی صد تعداد صدر مملکت کی نامزد کردہ ہو گی اور ۲۸ فی صد ارکان کو علاقائی گورنر نامزد کریں گے۔ انڈونیشیا کی پارلیمان کی موجودہ صورت حال کو نہضتہ العلما کے قائد یوسف ہاشم نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ انڈونیشی پارلیمان پر چار "ڈ" غالب ہیں۔ پہلا ڈ' ہے ڈاٹانگ' یعنی آیئے' دوسرا ڈوڈک' یعنی تشریف رکھیے' تیسرا ہے ڈیان' یعنی ذرا خاموش رہیے اور آخری ڈ' ہے ڈیواٹ جس کے معنی ہیں لیجیے کچھ پیسے رکھ لیجیے۔ انڈونیشیا میں پارلیمان کو چلانے کا یہی طریقہ ہے اور یہ طریقہ مشرق وسطیٰ کے دوسرے بہت سے ممالک سے مختلف نہیں ہے۔

اس سب کچھ کے علی الرغم اسلامی جماعتیں پچھلے تیس برسوں میں انڈونیشیا اور دوسرے بہت سے مسلمان ممالک میں مسلسل کوشاں رہی ہیں کہ وہ مروجہ نظام کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے کام کرتی رہیں' آئین کی پابندی کریں اور قانونی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے چلیں۔ لیکن اس کا کیا کیجیے کہ قانونی ڈھانچہ بھی انھی کو نقصان پہنچانے' انھی کی راہ روکنے کے لیے بدلتا رہتا ہے۔ انھوں نے دیانت داری سے کھیل کے تمام قواعد کی پابندی کی ہے اور جمہوری حزب اختلاف کا کردار ادا کیا ہے مگر کس قدر المناک ستم ظریفی ہے کہ جمہوریت کی بقا اور قانون کی حکمرانی کے تحفظ کے نام پر سیاسی اسلام کی ممکنہ آمریت الجزائر' مصر اور تیونس کی حکومتوں نے فوجی آمریتوں اور فوجی عدالتوں کو قبول کیا' سیاسی آزادیوں پر پابندی اور ہزاروں سیاسی مخالفین کو فرد جرم عائد کرنے اور مقدمات چلانے کا تکلف کیے بغیر قید و بند اور طاقت سے کچلنے کی راہ اختیار کی۔ مصر میں دو درجن سے زائد لوگوں کو فوجی عدالت نے کسی بھی قسم کی اپیل کے بغیر سزائے موت دی۔ یہ حقوق انسانی کی بدترین خلاف ورزیاں ہیں اور اب یہ حکمران چاہتے ہیں کہ ان کے مغربی اتحادی ان کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت ان کا تقابل ان فرضی و خیالی اسلامی حکومتوں سے کریں' جن کا کہیں وجود نہیں مگر جو ان کے خیال میں موجودہ مسلمان حکومتوں سے کہیں زیادہ جابر ہوں گی۔ اگر موجودہ حکمران کمزور پڑ گئے تو اسلام پرست آ جائیں گے۔ یہ حکمران اپنے آپ کو مغربی اتحادیوں کے خصوصی سلوک کا مستحق سمجھتے ہیں کیونکہ اولاً وہ ایک خصوصی خطرے کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ثانیاً اسلام کے خطرے کے خلاف مغرب کا دفاع کر رہے ہیں۔

یہ سوال کہ سیاسی اسلام' جمہوری حزب اختلاف کا کردار ادا کر سکتا ہے یا نہیں کوئی دینی سوال نہیں' یہ ایک عمرانی اور سیاسی سوال ہے۔ اس کا جواب اسلام کی دینی تعلیمات یا مذہبی فکر میں نہیں ملے گا۔ اس کا جواب اسلامی معاشروں کی سیاسی اور سماجی صورت حال کے مطالعے ہی سے ممکن ہے۔ اسلام پرست یا جن کو یہاں اسلامی بنیاد پرست کہا جاتا ہے' مغرب کے عام تصور کے مطابق نہ علما ہیں' نہ محض مذہبی موشگافیاں

کرنے والے ماہرین علم کلام و جدلیت اور نہ محض فقیہہ' اس کے برعکس وہ ہر اعتبار سے باقاعدہ سیاسی لوگ ہیں' سیاست دان کی تعریف پر پورے اترنے والے۔

ہمیں اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ سیاسی اسلام' اسلامی معاشروں میں پائے جانے والے مذہبی' فکری' نظریاتی اور سیاسی راستوں میں سے ایک راستہ ہے' اسلامی دنیا میں اور بھی بہت کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے جسے بدقسمتی سے سی این این اور نیویارک ٹائمز رپورٹ نہیں کرتے۔ یہ مذہبی اور فکری راستے جو زیادہ نہیں تو اتنے ہی اسلامی و دینی ہیں' کسی وقت اس سیاسی اسلام کے لیے چیلنج ثابت ہو سکتے ہیں' جسے ۱۹۸۰ کے عشرے میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ وسیع المشرب اور جدید اسلام بھی کسی وقت سیاسی اسلام کے مقابل اٹھ کھڑا ہو۔ جنوب اور جنوبی ایشیائی ممالک میں روایتی مذہب میں بھی ایک خاموش تر اور غیر سیاسی احیا کا عمل جاری ہے جو مسلم معاشروں میں سیاسی اسلام کے لیے ایک بڑا چیلنج بن سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ترکی' وسطی ایشیا' شمالی افریقہ کے کچھ علاقوں اور ہندستان' پاکستان' بنگلہ دیش اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں ایک صوفی تحریک بھی برپا ہے۔ مزید برآں روایتی اسلام کا establishment یعنی علما ہیں جو سیاسی اسلام کے عروج سے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے ہروقت جوابی ردعمل کا امکان موجود رہتا ہے۔ مراعات یافتہ مذہبی قوتیں اکثر حکمرانوں کے ساتھ مل جاتی ہیں اور سیاسی اسلام یا بنیاد پرستی کی اٹھتی ہوئی لہر کے خلاف لڑنے کے لیے اتحاد کر سکتی ہیں۔ بدقسمتی سے یہ غیر سیاسی اسلامی تحریکیں مغربی اسکالرز کے مطالعے میں نہیں آتیں اور سی این این کے رپورٹروں کی دسترس سے بھی باہر رہتی ہیں۔

جہاں تک سیاسی اسلام کا تعلق ہے ہم دو قسم کی تحریکوں کے درمیان تفریق کر سکتے ہیں' ایک قسم وہ ہے جو قومی دھارے میں شریک' معتدل اسلامی تحریکیں ہیں' ان میں جماعت اسلامی پاکستان' جماعت اسلامی بنگلہ دیش' رفاہ پارٹی ترکی' نہضتہ پارٹی یا سابق اسلامی رجحان' تحریک تیونس' اخوان المسلمون مصر' اخوان المسلمون اردن' پاس (PAS) ملائیشیا اور نہضتہ العلما انڈونیشیا شامل ہیں۔ یہ سب تحریکیں یا تو باقاعدہ طور پر سیاسی عمل میں شریک ہیں یا موقع ملنے پر امن' قانونی و آئینی اور جمہوری طریقے پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اگر ان کو موقع فراہم کر دیا جائے تو ان کی خواہش ہو گی کہ ان ملکوں کی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح وہ بھی سیاسی عمل میں شریک ہوں۔ مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ تمام تحریکیں ذمہ دار' جمہوری حزب اختلاف کا کردار بخوبی ادا کر سکتی ہیں۔ بلکہ فی الحقیقت ان میں کچھ' مثلاً ترکی کی رفاہ پارٹی' پاکستان کی جماعت اسلامی' ملائیشیا کی پاس اور اردن کی اخوان المسلمون--- تو پہلے ہی سے جمہوری حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ دوسرے قلیل تعداد کے انتہا پسند' انقلابی' عسکری' تشدد پسند اور خفیہ

اسلامی گروہ ہیں جو قومی اور بین الاقوامی دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ اس وقت اس سوال میں نہ جایئے کہ ان تحریکوں کو پرتشدد ذرائع استعمال کرنے کی طرف لے جانے والے اسباب اور محرکات کیا تھے۔ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے ممالک میں آج الجزائر' مصر اور اسرائیل ان کا ہدف ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ہم ان گروہوں سے اس بات کی توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ جمہوری طرز کی حزب اختلاف بن سکیں گے۔ کم از کم مستقبل قریب میں ایسا ممکن نہیں یا یوں کہیے کہ متعلقہ ممالک کی سیاسی صورت حال میں کسی بڑی تبدیلی کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔

جہاں تک معتدل اسلامی گروہوں کا تعلق ہے مجھے ان کو جمہوری سیاسی اکھاڑے میں آزادانہ مقابلے کی اجازت دینے میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ اولاً جب ساری تگ و تاز کو سیاسی اکھاڑے میں علامتی طور پر' بامعنی اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے حقیقی مقابلہ ہوتا ہے تو نظریاتی موقف کی سختی میں عملی مصلحت کی نرمی شامل ہو جاتی ہے۔ ثانیاً" اسلامی تحریکوں کو جمہوری سیاست میں دوسرے سیاسی افراد اور گروہوں سے اتحاد کرنا پڑیں گے اور اپنے کچھ مرغوب نعروں کو چھوڑنا پڑے گا۔ جب ملائیشیا میں اسلامی احیا کی نقیب مسلم یوتھ موومنٹ سیکولر رویے کی حکمران جماعت اومنو (UMNO) سے جا ملی تو اسے اپنے کئی پسندیدہ اسلامی منصوبے ترک کرنے پڑے۔ اسی طرح ۸۰ کی دہائی میں تیونس کی اسلامی رجحان تحریک نے مرکزی ٹویڈ یونین پارٹی' ہیومن رائٹس لیگ اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ اتحاد کیا' یہاں تک کہ اسے عوامی متحدہ پارٹی اور کیمونسٹوں کے ساتھ بھی اتحاد کرنا پڑا تو اسے اپنے کئی ایک اسلامی مطالبات سے دستبردار ہونا پڑا۔ انھی برسوں میں مصر میں اخوان المسلمون نے وفد پارٹی سے اتحاد کیا جو بنیادی طور پر ایک سیکولر اور لبرل پارٹی ہے۔ جماعت اسلامی کو پاکستان کی طویل تاریخ میں انتہائی دائیں بازو سے لے کر انتہائی بائیں بازو تک کی جماعتوں سے اتحاد کرنے پڑے۔ جماعت اسلامی بنگلہ دیش نے حال ہی میں اپنی سابقہ دشمن عوامی لیگ سے اتحاد کیا' اسی عوامی لیگ کے ساتھ جو امیر جماعت اسلامی کو پھانسی دینے کا مطالبہ کرتی رہی۔ نجم الدین اربکان کی رفاہ پارٹی نے حال ہی میں ترکی کے انتخابات میں ۲۱ فی صد ووٹ حاصل کیے۔ اس پارٹی کا نام ملی نظام پارٹی' پھر نظام نو پارٹی' پھر ملی سلامت پارٹی رہا۔ ان مختلف ادوار میں اس نے تمام بڑی سیکولر قومی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کیے۔ اسے نام کی تبدیلی کے مرحلوں سے بار بار گزرنا پڑا' اس لیے کہ ہر فوجی انقلاب اور بغاوت کے بعد اس پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا جاتا اور اس کے قائدین کو جیل بھیج دیا جاتا۔ لیکن رفاہ مختلف ناموں کے تحت بار بار زندہ ہوتی رہی۔ یہ ہر جنم میں نظام کے اندر رہتے ہوئے کام کرنے پر تیار رہتی رہی۔

دلچسپ سوال یہ ہے کہ ان دینی جماعتوں کو جمہوری سیاست میں حصہ دار بننے کے عمل میں کون کون سے سمجھوتے کرنے پڑے۔ مثلاً جماعت اسلامی پاکستان کو محترمہ فاطمہ جناح کو اسلامی ریاست کی صدارتی

امیدوار کے طور پر تسلیم کرنا پڑا۔ یاد رہے کہ جماعت کے بانی سید مودودیؒ اپنی پہلے کی تحریروں میں لکھ چکے تھے کہ ایک عورت کسی اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ لیکن چونکہ وہ دوسری جماعتوں کے ساتھ اتحاد کر چکے تھے اس لیے انھیں اپنے موقف میں ترمیم کرنی پڑی۔ ۱۹۸۸ میں جماعت اسلامی نے بے نظیر بھٹو کو ایک اسلامی حکومت کے سربراہ کے طور پر قبول کیا۔ خالدہ ضیا ایک عورت ہوتے ہوئے جماعت اسلامی کے ۲۰ ووٹوں کے بغیر بنگلہ دیش کی وزیراعظم نہ بن سکتی تھیں۔ رفاہ اور اس کے تمام پیش رووں نے ترکی کے سیکولر آئینی ڈھانچے کو تسلیم کیا اور نجم الدین اربکان نے' جو کسی طور پر بھی اس میدان میں نو آموز نہیں ہیں' وعدہ کیا کہ وہ ترکی کے سیکولر آئینی فریم ورک کو قائم رکھیں گے۔ انڈونیشیا کی نہضتہ العلما نے اپنے پلیٹ فارم سے اسلام کا نام تک ہٹا دیا اور لادینی سمت رکھنے والے پانچ ریاستی اصولوں کو اختیار کیا جنھیں پنچ شیلا کہتے ہیں۔[7] ان مثالوں سے عیاں ہے کہ اگر اسلامی گروہوں کو جمہوری عمل میں آزادانہ شرکت کرنے کے مواقع ملیں تو وہ نہ صرف سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات اپنے بنیادی قسم کے نظریاتی مطالبات سے بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے مغرب کو ان کا کوئی عمل بھی پسند نہیں آیا۔ اگر وہ ایرانیوں کی طرح جمہوری طریق کار کو پس پشت ڈالیں' انقلابی راستہ اختیار کریں' تو انھیں بلاتامل باغی قرار دے کر ریاستی جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اور اگر وہ جمہوری راستہ اختیار کریں' انتخابات میں حصہ لیں اور کبھی کبھار الجزائر (۱۹۹۲) کی طرح جیت بھی جائیں تو ان پر جمہوریت کو اغوا (ہائی جیک) کر لے جانے کا الزام دھرا جاتا ہے اور "گربہ کشتن روز اول" کے مصداق انھیں فوری طور پر بزور قوت دبا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی سیاسی مصلحتوں اور دستور سیاست کے مطابق دوسرے سیاسی گروہوں سے اتحاد کر لیں' جس طرح انھوں نے تیونس' پاکستان اور بنگلہ دیش میں کیا ۔۔۔ تو انھیں موقع پرست' اقتدار کے بھوکے اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کے طعنے دیے جاتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں اور خود کو دیگر سیاسی گروہوں سے الگ تھلگ رکھیں تو انھیں نظریاتی طور پر جامد' ڈھیٹ اور ہٹ دھرم قرار دیا جاتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کی مشکل یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ اسلام کے مطابق تبدیلی کا تفصیلی نقشہ پیش کریں تو انھیں فوراً Totalitarian قرار دے دیا جاتا ہے کیونکہ وہ سماجی' معاشی اور سیاسی زندگی کے ہر شعبے کو قابو میں لانا چاہتے ہیں۔

اس کے برعکس مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جب الجزائر میں ۹۲ میں اسلامی فرنٹ (FIS) کو فوجی کارروائی سے کچل دیا تو امریکی ٹی وی کے ان گنت مبصرین بڑھ چڑھ کر باتیں بناتے تھے کہ FIS کے پاس کوئی پروگرام نہ تھا' ان کا سیاسی منصوبہ غیرواضح' مبہم اور سطحی قسم کا تھا' ان کے پاس کام کا صرف ایک مختصر خاکہ تھا۔ ان سب اعتراضات سے وہ یہ اخذ کرتے کہ ان اسلامی جماعتوں میں اپنے معاشروں کے مسائل سے نمٹنے

کی کوئی صلاحیت نہیں۔

اکثر اوقات یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اسلامی تحریکوں اور ان زعما کی جمہوریت سے وابستگی حقیقی اور قابل اعتبار (genuine) نہیں' ان کے جمہوریت پسندی کے دعووں کا سبب عالمی بساط پر قبول عام اور جواز حاصل کرنا ہے' یا پھر قومی سیاست میں چند عملی فائدوں کا حصول۔ اس پر میں دو باتیں کہنا چاہوں گا۔ اولاً جیسا کہ ڈنک وٹ وشاؤ نے کہا ہے: "ایک ناخوشگوار فیصلے کا کڑوا گھونٹ چند دنوں میں اپنی کڑواہٹ کھو بیٹھتا ہے اور بھلا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کیونکہ فیصلہ کرنے والا سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ یوں بھی بسر ہو سکتی ہے"۔

وہ اُسے عادی ہو جانے کا عمل قرار دیتا ہے۔ اس کی مثال سویڈن کی کنزرویٹو پارٹی ہے جو ۱۹۱۸ کی جمہوریت دشمن پارٹی سے ۱۹۳۶ کی مکمل جمہوری تحریک بن گئی۔ دو عشروں کے دوران وہ لوگ ریٹائر ہو گئے جنھوں نے جمہوریت کو باول ناخواستہ قبول کیا تھا اور رہنماؤں کی نئی نسل نے معاملات سنبھال لیے جو حقیقی طور پر جمہوری تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کا عمل ڈارونی طرز کے انتخاب (selection) کا آغاز کر دیتا ہے۔ یہ جمہوریت پسندوں کے حق میں ہوتا ہے۔ اگر ہم اسلام پرستوں کی موجودہ قیادت کے جمہوریت پسند ہونے کے دعووں کو موقع پرستی یا حکمت عملی بھی قرار دیں تو یہ یقین کرنے کی معقول وجوہ ہیں کہ جمہوری نظام میں کام کرنے سے یہ موقع پرستانہ تعلق' اگلی نسل کے رہنماؤں اور کارکنوں میں زیادہ موثر اور حقیقی تعلق میں تبدیل ہو جائے گا۔ میرے خیال سے یہ بھی اس کے بغیر ممکن نہیں ہو گا کہ اسلام پرستوں کو جمہوریت میں سیاسی اقتدار کے مواقع نظر آئیں۔

مختلف دینی یا دیگر سیاسی گروہوں کے جمہوری حزب اختلاف بنے رہنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان معاشروں میں اقتدار کی سخت گرفت کچھ ڈھیلی پڑے اور سیاسی اثر و نفوذ کی مرکزیت کا موثر اور بامعنی خاتمہ ہو۔ ایک وفاقی جمہوری نظام میں اس طرح کا اہتمام بالکل ممکن ہے کہ ایک انتخاب جیتنے والا سبھی کچھ نہ لے اڑے اور حکومت و قوت میں بہت سے لوگ حصہ دار بن سکیں۔ مرکزی یا وفاقی' صوبائی اور مقامی حلقوں کی بنیاد پر قائم نظام میں انتخابی عمل کے کئی درجات اور سطحیں ہوتی ہیں اور اس بات کا ہر وقت امکان رہتا ہے کہ کوئی جماعت مرکز یا وفاق میں شکست کھا جائے اور حکومت نہ بنا سکے مگر صوبائی سطح پر انتخاب جیت کر وہاں کی حکومت میں آ جائے۔ اس طرح ایک ہی پارٹی وفاقی سطح پر انتخاب جیت کر وہاں کی حکومت میں آ جائے۔ اس طرح ایک ہی پارٹی وفاقی سطح پر حزب اختلاف اور صوبائی یا علاقائی سطح پر حزب اقتدار کا کردار بیک وقت ادا کرے۔ اس کی بہترین مثال ملائیشیا میں ملتی ہے۔

ملائیشیا کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز پر نظر رکھنے والے لوگ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ قومی اور وفاقی سطح پر حکمران اومنو (UMNO) اور پچھلے برس سے کم از کم تین ریاستوں میں غالب و حکمران اسلامی جماعت، پاس (PASS) میں ایک کارگر تعلق استوار چلا آ رہا ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر مجھے کلنتان جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پاس دوسری مرتبہ حکومت میں آئی ہے۔ پہلی بار اس نے ریاست کلنتان کی اسمبلی میں ۹۹ فیصد نشستیں جیتیں۔ درحقیقت انھیں خود ہی اس بات کا اہتمام کرنا پڑا کہ کم از کم ایک رکن حزب اختلاف سے بھی منتخب ہو جائے ورنہ اسمبلی کی کارروائی بالکل ہی بے مزہ ہو جاتی۔ پاس ایک مرتبہ پھر جیت گئی ہے اور اومنو (UMNO) جو کہ وسیع البنیاد جماعت ہے اور قومی وفاقی سطح پر حکمران ہے، کلنتان میں ریاستی سطح پر جمہوری حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی ہے اور قومی سطح پر اومنو کی حکمرانی ہے اور پاس جمہوری حزب اختلاف ہے۔ پاکستان میں ۱۹۷۰ کی دہائی کے وسط میں بے نظیر بھٹو کے والد مرکز میں وزیراعظم تھے اور صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں جو حکومتیں قائم تھیں وہ اسلامی جماعتوں کے زیراثر تھیں۔ سب جانتے ہیں کہ ترکی میں رفاہ نے بہت سے اہم شہروں اور قصبوں کے انتخابات جیتے ہیں اور اس میں استنبول کے میئر کی نشست بھی شامل ہے۔ ان تمام مثالوں سے عیاں ہے کہ جب اسلامی جماعتیں جمہوری نظام کا حصہ بنتی ہیں تو انھیں بھی نظام کے اندر کچھ نہ کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ انھیں اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ ماتحت درجے ہی میں سہی، قوت و اقتدار میں حصہ دار بنیں۔ یوں اس جمہوری نظام سے ان کے اپنے مفادات وابستہ ہو جاتے ہیں جو ان کو حکومت میں آنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرح جب ان کے اپنے مفادات اسی نظام سے وابستہ ہو جائیں تو وہ نہایت سنجیدگی سے اس عمل میں شریک ہو جاتے ہیں جسے امریکی انتظامیہ کے لوگ بین الحکومتی تعلقات کہتے ہیں، یعنی وفاقی سطح پر سیکولر جماعت کے ساتھ مذاکرات، سمجھوتے، سودے بازی اور محاصل میں شرکت۔

میں یہاں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ مختلف اسلامی دانش وروں کے جمہوریت کے بارے میں کیا خیالات ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جن کا جنوب مشرق اور وسطی ایشیا اور شمالی افریقہ تک کی تمام اسلامی تحریکوں کی نظریاتی تربیت میں بہت حصہ ہے، جمہوریت اور جمہوری عمل کے بہت بڑے داعی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی تحریک کے اولین مرحلے میں جب اخوان المسلمون خفیہ قسم کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگی تو مولانا مودودیؒ ہی تھے جنھوں نے اخوان کے قائدین اور کارکنوں سے ملاقات کی اور انھیں پرتشدد سرگرمیوں سے روکا۔ اس مسئلے پر مولانا مودودیؒ دو ٹوک موقف رکھتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی تبدیلی جو قتل، محلاتی سازشوں اور فوجی بغاوتوں جیسے انقلابی ذرائع کے ذریعے سے آئے، اسلامی نہیں ہو گی۔ ان کے نزدیک مقاصد کے ساتھ ساتھ ذرائع کا اخلاقی ہونا بھی

ضروری ہے۔ اسی طرح النہضہ تحریک تیونس کے سربراہ، شیخ عبدالرشید الغنوشی بھی کثیرالجماعتی جمہوریت کے بہت بڑے حامی ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کوئی بھی اسلامی جماعت عوام کے قلب و ذہن میں تبدیلی کے لیے قوت کا استعمال نہ کر سکتی ہے نہ اسے کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا کام اپنے پیغام کی پرامن، قانونی اور جمہوری طریقوں سے تبلیغ کرنا ہے۔ اگر لوگ ہمارے پیغام کو قبول کر لیں اور ہمارے حق میں رائے دیں تو اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے اور اگر وہ ہمیں رد کر دیں تو بھی ہم ان کی رائے کا احترام کریں گے۔

انگلستان سے شائع ہونے والے ایک اسلامی رسالے Encounter کی قریبی اشاعت میں اخوان المسلمون، مصر کی طرف سے جاری کردہ ایک بیان کو دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس بیان میں اخوان نے دو ٹوک طریقے پر کثیرالجماعتی سیاسی نظام کو کسی بھی قسم کے تامل اور شرائط اور تحفظات کے بغیر قبول کیا ہے۔ وہ نہ صرف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام، جمہوریت کی اجازت دیتا ہے بلکہ یہ تک کہتے ہیں کہ اسلامی تحریکوں کی بقا اور نشوونما صرف اس ماحول میں ممکن ہے جہاں مختلف الخیال سیاسی گروہوں کو آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت ہو۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ہمارے خیال میں اسلامی تحریکوں کی جمہوریت سے وابستگی دائمی و حقیقی اور موثر قسم کی بجائے صرف مصلحت آمیز، وقتی یا ضرورت کے تحت بھی ہو تو بھی اس کا احترام کیا جانا چاہیے۔ اسلامی تحریکوں نے فوجی آمریت کے تحت ہی سختیاں جھیلی ہیں اور جمہوری صورت حال کے تحت کبھی نہیں۔ ترکی کے فوجی انقلابوں کے نتیجے میں رفاہ پارٹی کو تین دفعہ غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور اس کے قائدین کو جیل بھیج دیا گیا۔ انھیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور ایک لیڈر کو موت کی سزا دے دی گئی۔ سہارتو کی فوجی قیادت کے تحت وہاں کی اسلامی تحریک نے سب سے زیادہ سختیاں جھیلیں۔ محمد ایوب خان کے مارشل لا اور فوجی قیادت ہی میں ممکن ہوا کہ جماعت اسلامی پاکستان پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ صرف جمہوری عمل ہی تھا جس نے انھیں آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت دی اور مقابلے کی سیاسی کش مکش میں اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا۔

اسی لیے اسلام پرست، جمہوریت کو خود اپنی بقا کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ وہ جمہوریت کے مشن کے سب سے بڑے حامی اور دعویدار ہیں۔ یہ صرف ایک آزاد، اور جمہوری بنیاد پر قائم سیاسی ڈھانچہ ہے جس میں انھیں شریک ہونے کی اجازت ملی، ترکی میں، پاکستان میں، اردن میں اور بنگلہ دیش میں اور نہ کہ مصر، تیونس یا الجزائر میں اور ہم عراق، شام اور لیبیا کے بارے میں تو بات ہی نہیں کر رہے۔ صاف ظاہر ہے کہ معمر قذافی، صدام حسین اور حافظ الاسد کے خلاف کسی جمہوری حزب اختلاف کے بننے یا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال : ترکی میں بہت سے مبصرین کا کہنا ہے کہ فوجی حکومت نے اسلامی سیاست کو نظرانداز کیا بلکہ کمیونسٹوں کا زور توڑنے کے لیے اس کی حمایت کی۔ اگر آپ مساجد کی تعمیر کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ان کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ یہ اس سے بالکل مختلف بات ہے جو آپ نے فرمائی ہے کہ فوجی حکومتوں میں اسلامی سیاست کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا؟

جواب : آپ کی بات سے میری بات کی تردید نہیں ہوتی کہ ہر فوجی انقلاب کے وقت اسلامی تحریک کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور سیاسی عمل میں شرکت سے محروم کر دیا گیا۔ جو آپ نے فرمایا اس میں بھی کچھ نہ کچھ حقیقت ہے۔ بہت سے مبصرین کا خیال ہے کہ ۱۹۷۰ کی دہائی میں انتہا پسند دائیں اور بائیں بازو کی کش مکش کے دوران ترکی میں فوج نے اعتدال پسند اسلامی گروہوں کو سیاسی عمل میں شامل ہونے پر ابھارا تاکہ کمیونسٹ خطرے کا توڑ ہو سکے۔ بہرحال یہ بات قابل غور ہے کہ ایک معروف ترک ماہر سیاسیات اوزبودین' اربکان کی زیر قیادت اسلامی رفاہ' پارٹی کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتا ہے کہ یہ ۱۹۷۰ کی دہائی کے اواخر میں ہر قسم کی سیاسی دہشت گردی اور تشدد سے دور رہی۔ درحقیقت ۱۹۷۰ کی دہائی میں یہی ایک سیاسی جماعت تھی جس نے تمام بڑی بڑی سیاسی قوتوں کے ساتھ روابط جاری رکھے جب کہ بڑی سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے گفتگو تک کے مراسم ختم کیے ہوئے تھیں۔ یہ اربکان ہی تھے جو ان دونوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنے اور انھوں نے بہت ہی مثبت کردار ادا کیا۔

یہ رفاہ کا وعدہ ہے کہ وہ ترکی کے سیکولرازم کے سوال کو دوبارہ نہیں اٹھائے گی۔ درحقیقت اربکان نے یہ کہا تھا کہ وہ ترکی کے سیاسی نظام کے سیکولر آئینی ڈھانچے کو قائم رکھے گا اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسے اپنے سیاسی پلیٹ فارم اور منشور میں اسلام کے نام کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کی پارٹی صرف قومی اہداف اور اخلاقی معیارات کی بات کرتی ہے جو اسلام کے لیے ان کی علامت ہے۔ ان تمام احتیاطی اقدامات کے باوجود اربکان جانتے ہیں' میرے خیال میں انقرہ میں رہنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ رفاہ ترکی کی فوجی انتظامیہ سے پیشگی سمجھوتے اور افہام و تفہیم کے بغیر اقتدار میں نہیں آ سکتی۔ رفاہ اور فوج کے درمیان کسی نہ کسی سمجھوتے کا طے پانا ضروری ہے۔ یہ سمجھوتہ ترکی کے مغرب سے تعلقات کی نوعیت' معاشی منصوبوں کی نوعیت' ترکی کی مشرق وسطی کے متعلق پالیسی اور اس سے بھی کہیں زیادہ اہم اسلام کے حوالے سے ترکی کے سیاسی نظام اور سیکولر آئین کی سالمیت کا سوال ہے۔ یہ وہ بنیادی عنوانات ہیں جن پر رفاہ اور فوجی انتظامیہ کو کسی نہ کسی اتفاق رائے پر پہنچنا ہو گا' تب ہی فوجی انتظامیہ رفاہ کو اس بات کی اجازت دے گی کہ وہ وزیراعظم کا تقرر کریں' کابینہ تشکیل دیں یا کسی مخلوط حکومت میں شریک ہوں۔

چند تبصرے جو میں نے ترکی کے انتخابی نتائج کے اعلان کے فوراً بعد پڑھے ان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ نجم الدین اربکان اور رفاہ پارٹی کے ۲۱ فی صد ووٹ حاصل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی افق پر ایک اور خمینی نمودار ہو رہا ہے۔ ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جب ہم اربکان کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم ایک ایسے شخص کے بارے میں بات کر رہے ہیں جو اپنی ٹیم کو ساتھ لے کر چلتا ہے، جو ترکی کے سیاسی نظام کا پچھلے پینتیس برس سے اہم حصہ ہے۔ وہ اور اس کی پارٹی تقریباً ہر مخلوط حکومت کا حصہ رہی ہے اور پچھلے تیس پینتیس برس کا عرصہ انھوں نے ایک جمہوری حزب اختلاف کے طور پر گزارا ہے۔ خود اربکان ترکی کے نائب وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہم کسی ایسے خمینی کے بارے میں بات نہیں کر رہے جو ماضی کی سیاست میں ایک غیر معروف حیثیت کا حامل ہو اور اچانک دارالسلطنت میں اترے اور سب کو فتح کر لے۔

س: اگر آپ اسرائیلی حکومت اور فلسطینی قومی مقتدرہ (Palestineian National Authority) کو رہنمائی فراہم کر رہے ہوں کہ وہ اسلامی تحریکوں بالخصوص حماس اور اسلامی جہاد کے ساتھ کس طرح معاملہ کریں تو آپ کیا کہیں گے؟

ج: اسرائیلیوں نے اس وقت میری رائے جاننا نہ چاہی جب وہ پی ایل او کی قوت اور اثر کو کم کرنے کے لیے حماس کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ اب جب کہ ان کے عمل کا نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے اور ان کا کیا خود ان کے گلے پڑ رہا ہے تو وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ حماس سے کیسے نپٹا جائے۔ میرے خیال میں انھیں خود اپنی پرانی جاسوسی رپورٹوں کی ورق گردانی کرنی چاہیے جس سے انھیں معلوم ہو گا کہ انھوں نے فلسطینی سیاست پر سے پی ایل او کی اجارہ داری توڑنے کے لیے کس طرح انقلابی اسلامی متبادل کی پذیرائی شروع کی تھی۔ اس چیز کے ثبوت اسرائیلی اور فلسطینی مصنفین کی تحریروں میں بہت واضح طور پر ملتے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جلد ہی اسرائیلی سیاسی منظر پر ظاہر ہوں گی اگر امن کا وہ عمل، جس پر اسرائیل نے فلسطینیوں کے ساتھ دستخط کیے ہیں بخیر و خوبی انجام پاتا ہے اور ہر چیز اپنے وقت پر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ انقلابی اسلامی حماس کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ ساتھ ہی اگر اسرائیل، شام اور لبنان کی حکومتوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کر لیتا ہے اور جنوبی لبنان کو جسے امریکی میڈیا عادتاً اسرائیل دفاعی علاقہ کہہ کر اشارہ کرتا ہے، چھوڑ دیتا ہے، تو اسرائیل کی شمالی سرحدوں پر تشدد کا ایک بہت بڑا سبب ختم ہو جائے گا۔ میرے خیال میں یہ دو باتیں انقلابی اسلامی تحریک کو کمزور کریں گی اور اسے موثر طریقے سے راستے سے ہٹا دیں گی۔ تیسری بات یہ ہے کہ حال ہی میں مشرق وسطیٰ میں دہشت گردی پر ہونے والی کانفرنس، جس میں صدر کلنٹن بھی موجود تھے، کا نتیجہ بھی اس شکل میں ظاہر ہو گا کہ ان تمام گروہوں میں باہمی تعاون کئی گنا

بڑھ جائے گا جو دہشت گرد سرگرمیوں کے نتائج سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اس حکومتی اور سراغ رساں سطح پر ابھرتے ہوئے تعاون کے نتیجے میں انقلابی اور انتہا پسندانہ گروہ کمزور ہوں گے اور ان کا دائرہ عمل سکڑ جائے گا۔ اسرائیل کے اندر بھی اور مشرق وسطیٰ میں دوسرے حصوں میں بھی۔ چوتھے، میرے خیال میں ان کے مالی ذرائع و وسائل پر بھی کڑی نظر رکھی جا رہی ہے اور وہ خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ میرا احساس یہ ہے کہ آج سے دس پندرہ برس بعد اسرائیلی، حماس کے قائدین کے ساتھ اسی طرح گفت و شنید کر رہے ہوں گے جس طرح آج یاسر عرفات کے ساتھ کر رہے ہیں جسے کل تک ایک دہشت گرد کہا جاتا تھا۔

س: میرا تعلق مصری سفارت خانے سے ہے۔ یہ تحریکیں جمہوریت کا دعویٰ کرتی رہی ہیں اور اسے اپنی بقا کے لیے ناگزیر سمجھتی ہیں۔ لیکن اصل امتحان تو اس وقت ہو گا جب انھیں اقتدار میں آنے کا موقع مل جائے۔ ایران اور سوڈان میں انھوں نے حزب اختلاف پر ظلم و جبر کیا ہے۔ مصر میں یقیناً برطانوی طرز کی جمہوریت نہیں ہے لیکن ہم نے ایک جمہوری عمل شروع کیا ہے، انتخابات ہوتے ہیں، پریس آزاد ہے، کئی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔

ج: خدا کرے مصر اپنے مسائل حل کرنے کے قابل ہو جائے۔ مصر، الجزائر کی طرح کثرت آبادی کا شکار ہے۔ وہاں معاشی اور عمرانی مسائل پائے جاتے ہیں جنھوں نے اسلامی تحریکوں کو کہیں زیادہ مقبول اور موثر بننے میں مدد دی ہے۔ مصر کی سیاسی صورت حال کے آپ کے تجزیے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ حسنی مبارک انقلابی، خفیہ، عسکری اور تشدد پسند اسلامی گروہوں اور معتدل اخوان المسلمون کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ بات نیویارک ٹائمز میں شائع ہوئی ہے اور اسے ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ریکارڈ کیا ہے کہ انتخابات سے کچھ ہی پہلے اخوان المسلمون کے سیکڑوں ارکان گرفتار کر لیے گئے ان میں سے اکثر ستر سے اسی برس کی عمر کے تھے۔ جب ان پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تو کسی پر بھی یہ الزام نہیں لگایا گیا کہ وہ پرتشدد کارروائیوں میں ملوث تھے۔ ان میں سے پچاس سے زیادہ کو تین سے پانچ سال تک قید کی سزا سنائی گئی۔ یہ سچ ہے کہ جن لوگوں کو موت کی سزا دی گئی ان کا تعلق زیر زمین اسلامی گروہوں سے تھا مگر انھیں یہ سزائیں فوجی عدالتوں نے سنائیں جن کے خلاف اپیل کا حق بھی نہیں۔

پھر ایک نیا پریس قانون جاری کیا گیا ہے جسے تمام انسانی حقوق کی تنظیموں بشمول بین الاقوامی تنظیموں نے ظالمانہ قرار دیا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں حاضرین کو یاد دلاتا چلوں کہ آیت اللہ خمینی کے سلمان رشدی کو ایک کتاب لکھنے پر موت کا فتویٰ جاری کرنے سے کہیں پہلے سید قطب کو مصر میں ایک کتاب لکھنے پر پھانسی دے دی گئی تھی۔ ان پر قطعاً یہ الزام نہیں لگایا گیا تھا کہ انھوں نے خود کسی پرتشدد کارروائی میں حصہ لیا ہو۔ انھوں نے وہ کتاب لکھی تو وہ جیل میں تھے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ انھوں نے ایسے خیالات کی

آبیاری کی جو مصری سیاسی نظام کے لیے بہت خطرناک سمجھے گئے۔ بدقسمتی سے اس وقت کسی نے ان کے مسئلے کو نہ اٹھایا اور نہ ہی ان کے افکار اور اظہار کی آزادی کے حق کا دفاع کیا گیا۔

میں مصر کا مقابلہ شام اور عراق سے نہیں کر رہا۔ مصر پھر بھی ایک کھلا معاشرہ ہے۔ میں مصری قوم کی جمہوریت اور آزادی کے لیے قربانیوں کا احترام کرتا ہوں۔ مصر عرب دنیا کا فکری راہنما ہے۔ لوگ مصر کی جانب دیکھتے ہیں لیکن اس وقت مصر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی طرح بھی نہ تو نظام کی کشادگی قرار دیا جا سکتا ہے نہ جمہوریت کا فروغ۔ ہم اسلام پرستوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں انتخابات میں حصہ نہیں لینے دیں گے کیونکہ ہمارا گمان یہ ہے کہ اگر تم انتخابات جیت گئے تو یہ آخری انتخابات ہوں گے اور تم لوگ جمہوری مشینری کو برباد کر دو گے۔ یہ بہت ہی عجیب بیان ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم پہلے ہی سے فرض کر لیتے ہیں کہ مصر، الجزائر اور تیونس میں جمہوریت قائم ہے اور یہ اسلامی تحریکیں اگر اقتدار میں آگئیں تو وہ ان پھلتی پھولتی جمہوریتوں کو بیخ زمین سے اکھاڑ دیں گی۔ متبادل کیا ہے؟ اسلامی تحریکوں کے اقتدار میں آنے کا متبادل فوجی آمریت ہے۔ یا ایک آمرانہ یک جماعتی نظام جو ہمیں مشرق وسطیٰ کے کئی ملکوں میں نظر آتا ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ انتخابات جیتی ہوئی اسلامی قوتوں کو اقتدار میں آنے سے روکنے کا کوئی جواز ہے۔ محض اس ڈر سے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ آمر بن جائیں یا آمر ثابت ہوں، جب کہ ان گنت مسلمان ممالک میں آمر پہلے ہی اقتدار پر قابض ہیں۔

س: میں یو ایس آئی اے سے ہوں۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید یو ایس آئی اے ان اسلامی گروہوں کے جمہوری رجحان کو سمجھنے میں غلطی کرتی ہے۔ کیا ہم لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہر وہ شے جس کے نام کا ایک جزو اسلامی ہو ردعمل اور تشدد کی حامل ہو گی؟

ج: تمام اسلامی تحریکیں بنیاد پرست نہیں ہیں۔ نہ تمام بنیاد پرست سیاسی ہیں، اور نہ ہی تمام بنیاد پرست اسلامی تحریکیں تشدد پسند ہیں۔ پچھلے سال جنوری میں، میں ڈھاکہ میں تھا جہاں قریب ہی تبلیغی جماعت کا ایک کنونشن ہو رہا تھا۔ دس لاکھ سے زائد مسلمان اس اجتماع میں جمع تھے اور یہ حج کے بعد دنیا کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ پچھلے برس اس جماعت کا ایک اجتماع لاہور کے قریب پاکستان میں ہوا تھا۔ دنیا بھر سے ۱۵ لاکھ مسلمان اس اجتماع میں شریک تھے۔ یہ اسلامی نشاتِ ثانیہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا سیاست سے دور کا واسطہ نہیں۔ یہ لوگ اسلامی شعور کو ذاتی نیکی کے طور پر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یوں بہت سی اسی قسم کی اسلامی تحریکیں ہیں جو مسلم معاشروں میں اہم اور فعال ثابت ہو رہی ہیں۔

س: میں ایک ترک صحافی ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلامی رفاہ پارٹی کو ایران اور سعودی عرب سے مالی امداد ملتی ہے۔ آخر سعودی عرب کا ترکی اور سیکولر حکومت کے خلاف اسلامی گروہوں کی پشت پناہی کا کیا مقصد ہے؟

ج : میں تو رفاہ پارٹی کے بیرونی مالی وسائل سے واقف نہیں ہوں۔ البتہ اگر وہ واقعی ایران اور سعودی عرب سے بیک وقت پیسہ لے رہے ہیں تو یقیناً ان کی ہوشیاری قابل رشک ہے۔ افغانستان میں جب کچھ گروہوں نے ایسا کرنا چاہا تو انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ سعودیوں نے کہا کہ اگر تمھیں ایران سے پیسہ مل رہا ہے تو ہم سے کوئی توقع مت رکھو۔ سعودی عرب کا اس میں فائدہ ہے کہ ترک حکومت، مشرق وسطیٰ میں ہونے والی پیش رفت میں زیادہ دلچسپی لے، خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ ترکی کی سرحدیں عراق اور شام سے ملتی ہیں۔ سعودی عرب کے ترکی سے نظریاتی نہ سہی اسٹرے ٹیجک مفادات وابستہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جب روس کے زوال پر پانچ مسلمان ریاستیں آزاد ہوئیں تو ترکی، سعودی عرب اور ایران ان نئے آزاد ہونے والے مسلمانوں کے دل جیتنے کے لیے ایک دوسرے کے رقیب بن گئے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ نجم الدین اربکان بہت عرصے تک سعودی امداد یافتہ (sponsored) ادارے، رابطہ عالم اسلامی کے رکن رہے ہیں۔ شاہ فیصل کے ساتھ ان کے بڑے قریبی ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن آج کل میرا خیال نہیں کہ ان کی پارٹی اور سعودی حکام کے کوئی تعلقات ہیں۔ ایرانی حکومت کو اربکان کے ساتھ کبھی کوئی ہمدردی نہیں رہی۔

س : میرا تعلق تیونس کے سفارت خانے سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تیونس کی نہضتہ کے سربراہ راشد غنوشی اپنی اعتدال پسندی کے لیے جانے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غنوشی ملک کے اندر قتل کی سازشیں اور تشدد کی سکیمیں تیار کر رہا تھا۔ میرے خیال میں اعتدال ان سرگرمیوں کی مکمل نفی ہے۔ ۱۹۸۷ کی تبدیلی کے بعد سے حکومت نے اس تحریک کو سیاسی عمل میں شرکت، قومی معاہدے پر دستخط کرنے کی اجازت دی۔ یہ معاہدہ سیاسی زندگی کی تنظیم کرتا ہے لیکن اس کے بعد یہ تحریک تشدد کی راہ پر چل نکلی۔ ہر روز ہڑتالیں ہوتیں اور تشدد کی کارروائیاں ہوتیں۔ اب جب کہ نہضتہ نہیں ہے، ہم اس علاقے کے اور افریقہ کے محفوظ ترین اور پرامن ترین ملکوں میں سے ہیں۔

ج : جو کچھ آپ نے فرمایا ہے میں اس کی تحقیر نہیں کرنا چاہتا لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کا بیان تیونس کی حکومت کے سرکاری نمایندوں کا بیان ہے۔ آپ کا فرض تھا کہ آپ یہی کہتے اور آپ نے اپنے فرض کو بخوبی نبھایا۔ لیکن بہرحال، ایمنسٹی انٹرنیشنل کی حالیہ رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۳۵ ہزار لوگ بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں پڑے ہیں۔

اخبارِ امت

سوڈان: جھوٹ کا پردہ چاک

مسلم سجاد

دنیا کے برے بھلے کے بزعم خود ذمہ دار امریکہ نے دنیا کے ۶ "دہشت گرد" ممالک کی جو تازہ فہرست جاری کی ہے اس میں حسب توقع ایک نام سوڈان کا بھی ہے جس کا یہ گناہ معاف ہی نہیں ہو تا کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے ترقی کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ' امریکہ کی باندی' اس کے احکامات کے مطابق سوڈان پر مرحلہ وار پابندیاں لگا رہی ہے' اسے جینے کا حق دینے کو تیار نہیں ہے۔

سوڈان پر جن الزامات کی وجہ سے یہ طوفان اٹھایا گیا ہے' ان کی حقیقت کیا ہے' یہ معلوم کرنے کے لیے امریکہ ہی کے شلر (Schiller) انسٹی ٹیوٹ نے ایک دفعہ ستمبر ۹۶ میں اور دوسری دفعہ فروری ۹۷ میں اپنے وفد سوڈان بھیجے۔ فروری والے وفد میں لارنس فری مین' ساؤتھ کیرولینا کے سابق سینیٹر تھیو مچل' ایریزونا سے کانگریس کے لیے ڈیماکریٹک پارٹی کی امیدوار ماریا ایلی نالٹن اور ستمبر والے وفد میں فری مین کے علاوہ ساؤتھ کیرولینا کے سابق ممبر کانگریس ری پبلی کن جان مین اور البامہ کے تھامس جیکسن شامل تھے۔ ممبران وفد نے ۲۰ مارچ ۹۷ کو نیشنل پریس کلب (واشنگٹن ڈی سی) میں اپنے مشاہدات پیش کیے۔ حاضرین میں متعدد سفارت خانوں کے علاوہ اخبارات اور نیوز ایجنسیوں کے' اور عرب لیگ اور سوڈان سے متعلق اداروں کے ۴۰ سے زائد نمایندے شریک تھے۔

فری مین نے بتایا کہ وفد بھیجنے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ ہم نے محسوس کیا کہ "سوڈانی قوم کو غیر مستحکم کرنے کے لیے ایک نہایت خراب عمل (nasty operation) جاری ہے" جس کی بنیاد سراسر جھوٹ ہے لیکن "واشنگٹن میں اس پر اعتبار کیا جا رہا ہے"۔ واشنگٹن سے کوئی سرکاری نمایندہ سوڈان نہیں گیا اس لیے کہ انھوں نے غلاموں کی خرید و فروخت' دہشت گردوں کو پناہ دینے اور عیسائیوں پر ظلم و ستم کے بارے میں تمام جھوٹے الزامات کو درست تسلیم کر لیا ہے۔ فری مین نے بتایا کہ یہ سارے جھوٹ کرسچین سالیڈیریٹی انٹرنیشنل (CSI) کے ذریعے پھیلائے جا رہے ہیں جو برطانوی دار الامرا کی رکن' بیرونس کیرولین

کاکس کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ فری مین نے حاضرین کو دعوت دی کہ "وہ خود سوڈان جائیں اور سچائی کو معلوم کریں"۔

سینیٹر تھیومچل نے شلر انسٹی ٹیوٹ کو انسانیت کی اس خدمت پر خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے وفد کے دوروں کی تفصیل پیش کی اور بتایا کہ "انھیں حکومت کے زیر سرپرستی غلاموں کے کسی کاروبار کا ثبوت نہیں ملا بلکہ اس پر تو وہاں سزائے موت ہے۔ سوڈان پر تو یہ ظلم کیا گیا ہے کہ ۱۲؍ جنوری کو ایتھوپیا اور اریٹریا نے جنوبی حصے پر حملہ کر کے چار قصبوں پر قبضہ کر لیا۔ وہ جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے۔ ۶ سو افراد مارے گئے جن کی لاشیں تک نہ اٹھانے دی گئیں، عورتوں بچوں تک کو قید کیا گیا اور انھیں ۳ دن تک بلاحرکت اپنے ہی فضلے میں ایک ہی جگہ بٹھائے رکھا گیا۔ انھوں نے عورتوں پر مشین گن چلائی، ان کی عصمت دری کی---" (اس ظلم پر دنیا میں کہیں احتجاج نہ ہوا!)

سینیٹر مچل نے بتایا کہ وفد کو مکمل آزادی تھی کہ جہاں چاہیں جائیں، جس سے چاہیں ملیں۔ وہ ہر مذہب کے رہنماؤں سے، ہر سطح کے سیاسی رہنماؤں سے، عام افراد سے ملے اور انھیں الزامات کے حق میں کوئی ثبوت نہ ملا (absolutely no evidence)۔ ہمیں کوئی ایسا لڑکا نہ دکھایا جا سکا جسے عیسائی سے مسلمان بنایا گیا ہو۔

ری پبلی کن جیمس مین نے سوڈان کے خلاف، جسے انھوں نے نہایت دوست ملک پایا، غلط خبریں پھیلانے میں پریس کے غلیظ (nasty) کردار کو موضوع بنایا۔ انھوں نے بالٹی مورسن (Baltimore Sun) کے دو نمایندوں کی شدید مذمت کی (ان میں سے ایک کانفرنس میں موجود تھا) جنھوں نے سوڈان میں غلامی کے الزام کو لیڈی کیرولین کاکس کے سٹ اپ کا حصہ بن کر پھیلایا۔ مین نے کہا کہ "میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی ایک اخباری رپورٹ سے اتنے تباہ کن نتائج مرتب ہوتے نہیں دیکھے"۔ "دنیا میں شور مچ گیا، سوڈان پر افتاد پڑ گئی اور امریکہ اور اقوام متحدہ نے پابندیوں کی منظوری دے دی"۔ مین نے بتایا کہ وہ سوڈان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے یہاں تک کہ غلاموں کے کاروبار کے بارے میں خبریں آنے لگیں: "میرے آبا و اجداد نے غلامی کا عذاب برداشت کیا تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا کہ اب بھی عرب کالوں کو غلام بنا رہے ہیں"۔ جب وہ ستمبر میں سوڈان گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حکومت نے کہا کہ جہاں چاہیں جا کر تحقیق کر لیں۔ "وزارت انصاف نے پورا ملک ہمارے لیے کھول دیا! میں نے خرطوم میں تین چرچ دیکھے۔ کسی پادری کو، کسی شخص کو، کسی غلام کا یا جنگی قیدیوں کی بطور غلام فروخت کا کوئی علم نہیں تھا۔ مین نے بالٹی مورسن کے رپورٹروں کو سوڈانی عوام اور حکومت کو بے عزت کرنے کا ذمہ دار قرار دیا۔ "انھیں ملک میں گھستے ہی غلاموں کا کیمپ مل گیا! یقیناً سب کچھ پہلے سے تیار تھا"۔

ماریا ملٹن نے امریکیوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کی حکمت عملی پر توجہ دلائی۔ امریکیوں کو کیسے جوش میں لایا جائے؟ یہاں افریقی امریکنوں کی بڑی آبادی ہے۔ غلامی کی خبریں انھیں اشتعال دلا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان خبروں کا کوئی مقصد نہیں، اس لیے کہ ہمیں غلامی کے لیے کسی منظم حمایت کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ امریکی قدامت پسندوں کو کیسے جوش دلایا جائے؟ ان کو عیسائیوں پر مسلمان بنیاد پرستوں کے مظالم کی کہانی سنائی جائے۔ رابرٹس کو یہ مسئلہ اٹھانے سے خوب پیسے مل رہے ہیں!

سوال جواب کے دوران بالٹی مورسن کے رپورٹر گریگوری کین نے کہا کہ وفد اس خاص جگہ نہیں گیا جہاں غلاموں کا کاروبار ہوتا ہے۔ کین اور اس کے دوسرے ساتھی گل لیتھویٹ نے واشنگٹن میں ایک اجلاس میں کچھ عرصے قبل تسلیم کیا تھا کہ جس آقا سے انھوں نے غلام خریدا تھا، وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ اپنا نام بتانے پر بھی آمادہ نہیں تھا کہ اگر حکومت کو معلوم ہوگیا تو اسے سزائے موت ملے گی۔ پھر بھی دونوں کا اصرار تھا کہ حکومت سوڈان، غلاموں کے کاروبار سے صرف نظر کرتی ہے۔ مین نے کین کو دعوت دی کہ وہ اس کے ساتھ سوڈان چلے۔ اس سے پہلے وہ غیر قانونی طور پر داخل ہوا تھا۔ کین نے کہا: "حکومت اسے ویزا نہیں دے گی"۔ فری مین نے اس جھوٹ کا پردہ چاک کیا اور بتایا: سوڈانی سفیر نے بالٹی مورسن کے دونوں رپورٹروں کو ذاتی طور پر سوڈان آنے کی دعوت دی کہ آئیں اور کسی پابندی کے بغیر خود تحقیق و تفتیش کر لیں۔ انھوں نے یہ دعوت نامہ مسترد کر دیا۔ (ماخوذ: ایگزیکٹو انٹیلی جنس رپورٹ ۱۸ اپریل ۹۷)

انڈونیشیا میں انتخابات

محمد ایوب منیر

اگر پاکستان میں جمہوری تحریکوں کے ذریعے آمریت سے نجات کی روایت نہ ہوتی اور آج ملک میں صدر ایوب کی حکومت ہوتی، تو ملک کا جو حال ہوتا اس پر آج کے انڈونیشیا کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۵ میں اشتراکی بغاوت کچلنے کے بعد، فوج نے عملاً اختیارات سنبھال لیے، بانی صدر سوئیکارنو نے اقتدار جنرل سوہارتو کے حوالے کیا جنھوں نے اسے ایسا سنبھالا کہ ۱۹۶۸، ۱۹۷۳، ۱۹۷۸، ۱۹۸۳، ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۳ میں بلامقابلہ صدر منتخب ہوتے رہے۔ اب ۲۹ مئی کو اسمبلی کے انتخابات کی تیاریاں ہیں۔ پہلے ہی سے پیش گوئی کر دی گئی ہے کہ صدر کی گولکار (Golkar) پارٹی کو ۷۰ فی صد ووٹ ملیں گے۔ پارٹی کے ممبروں کی تعداد ہی ساڑھے تین کروڑ سے زائد ہے۔

مسلم ممالک میں انتخابات خبروں کا موضوع تو بنتے ہیں لیکن یہ عموماً عوام کی مرضی کے مطابق حکومت منتخب کرنے کے لیے نہیں، بلکہ کرسی اقتدار پر متمکن ٹولے کو جمہوری سند جواز فراہم کرنے کے لیے ہوتے

ہیں۔ جمہوریت سکہ رائج الوقت ہے اس لیے اس کے معروف طریق کار میں ایسی تبدیلیاں کر لی جاتی ہیں کہ الیکشن بھی گذر جائیں اور اقتدار پر آنچ بھی نہ آئے۔ اس کی ایک شکل اقتدار میں فوج کی' جسے فی الاصل منتخب قیادت کا تابع فرمان ہونا چاہیے' شرکت ہے بلکہ اسے ویٹو پاور دینا ہے۔ الجزائر میں جو کچھ ہوا اور اب جس طرح اسلامک فرنٹ پر پابندی لگا کر اور قتل و غارت کر کے انتخابات کروائے جا رہے ہیں' ترکی سے جو خبریں آ رہی ہیں' سب کے سامنے ہیں۔ لیبیا' عراق' تیونس اور شام کا تو ذکر ہی نہیں۔

۱۳ ہزار ۷ سو جزائر پر مشتمل' ۲۰ کروڑ آبادی کا ملک انڈونیشیا' عالم اسلام کا سب سے بڑا اور دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے۔ (مسلمان آبادی کا ۸۵ فی صد اور عیسائی ۱۰ فی صد ہیں۔ انڈونیشیا مسیحی تبلیغی سرگرمیوں کا خصوصی ہدف ہے اور اس پر غیر معمولی وسائل صرف کیے جا رہے ہیں۔ سرکاری پالیسیوں سے بھی انھیں تائید اور حمایت فراہم ہوتی ہے)۔ ملک کا دستور اس طرح بنایا گیا ہے کہ اقتدار فوج کے ہاتھ سے نہ نکلے۔ ایوان نمایندگان میں ۴۲۵ ممبر عام ووٹ سے منتخب ہوتے ہیں' ۷۵' فوجی جنرل نامزد کرتے ہیں۔ ان ۵ سو کے ساتھ صدر کے نامزد ۵ سو مل کر پارلیمنٹ تشکیل کرتے ہیں (صدر ایوب اس "جمہوریت" کا خواب دیکھتے رخصت ہو گئے!)۔ لیکن صدر سوہارتو اس پارلیمنٹ یا اپنی کابینہ کے بھی پابند نہیں ہیں!

گولکار کے علاوہ دیگر پارٹیاں بھی ہیں۔ گذشتہ دنوں ڈیماکریٹک پارٹی خبروں کا موضوع بنی جب اس کی صدر' سوئیکارنو کی بیٹی' میگاوتی' امریکی ہفت روزوں کے سرورق کی زینت بنی (جس کی تمنا کرتے ہمارے بعض حکمران اس دنیا سے سدھار گئے) اور محسوس ہوا کہ مغرب ترکی' پاکستان اور بنگلہ دیش کے بعد اب اس چوتھے ملک میں بھی نسوانی قیادت لانا چاہتا ہے۔ ۹۲ کے انتخابات میں اس پارٹی کو ۱۵ فی صد ووٹ ملے تھے۔ میگاوتی کی قیادت میں ظلم اور کرپشن کے خلاف ہونے والے مظاہرے سختی سے کچل دیے گئے اور مسئلے کا علاج یہ کیا گیا کہ سوہارتو نے میگاوتی کو پارٹی صدارت سے ہٹوا کر اپنی مرضی کا صدر منتخب کروا دیا۔ میگاوتی اور اس کے حامیوں نے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا ہے اور بعد میں جعلی انتخابات کے خلاف مہم چلانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ انڈونیشیا میں ووٹ نہ دینا جرم ہے۔ تیسری' ڈویلپمنٹ پارٹی' اسلام کی حامی تصور کی جاتی ہے' پریس اور آزادیوں پر پابندی کی مذمت کرتی ہے' ۹۲ کے انتخابات میں اسے ۱۷ فی صد ووٹ ملے تھے۔ تاہم صدر کے لیے یہ سوہارتو کو ہی ووٹ دیں گے۔ چوتھی' نہضتہ العلما اس پوزیشن میں نہیں کہ انتخابات میں کامیابی حاصل کر سکے۔

صدر سوہارتو کے تیس سالہ دور حکومت میں کئی بڑے منصوبوں پر عمل ہوا ہے' اقتصادی ترقی ہوئی ہے۔ اس کے بغیر اتنی بڑی آبادی کے متنوع' کلچر رکھنے والے ملک پر حکومت کرنا ممکن نہ ہوتا۔ لیکن ساتھ ہی کرپشن کا بھی دور دورہ ہے اور صدر سوہارتو کے اہل خاندان اس میدان میں خصوصی شہرت رکھتے ہیں' ہر بڑے منصوبے میں کوئی نہ کوئی بیٹا ضرور ہوتا ہے۔ حال ہی میں سونے کی کانوں کا جو صدی کا سب سے بڑا اسکینڈل ہوا ہے' اس میں بھی ایک نام ہے۔ انتخابات میں ۴ بیٹے منتخب ہونے والے ہیں۔ ایک بیٹی بھی ہے

جسے نائب صدر بنانے کا پروگرام ہے تاکہ سوہارتو (عمر ۷۵ سال) کی اچانک موت کی صورت میں صدارت گھر سے باہر نہ جائے۔ فوج کی طرف سے عوام پر دباؤ ہے کہ گولکار کو ووٹ دیں۔ فوجی پریڈ اور جلوس، شہروں اور قصبوں میں نکالے جا رہے ہیں۔

مسلم ممالک میں جس انداز کے بھی "جمہوری" تجربات کیے جا رہے ہیں بہرحال مطالعے کا موضوع ہیں۔ پاکستان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ ہم نسبتاً آزاد فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ہم امت مسلمہ کا ایک حصہ ہیں اور ہماری جامعات اور علمی و تحقیقی اداروں کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ مسلم ممالک کے حالات کا براہ راست گہرا مطالعہ کریں، مغرب کی عینک سے نہیں۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ ۲۰ کروڑ مسلمان کے ملک میں انتخابات ہو رہے ہوں اور پاکستان کے کسی اخبار یا نیوز ایجنسی کا نمایندہ رپورٹنگ کے لیے نہ گیا ہو، سیکھنے کے لیے نہ سہی، بیچنے کے لیے سہی۔

وسط ایشیا: حریص نگاہوں کا مرکز

مسلم سجاد

وسط ایشیا کی نو آزاد پانچ مسلم ریاستیں قدرتی وسائل خصوصاً تیل اور گیس سے مالا مال ہیں لیکن پسماندہ ہیں، رسل و رسائل کے ذرائع ترقی یافتہ نہیں، سرخ فیتے کا شکار ہیں، دور دراز واقع ہیں۔ ازبکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کے چاروں طرف ساحل سمندر سے محروم ممالک ہیں۔ دوسری طرف آزادی کے بعد، کرغیزستان کے علاوہ چاروں ممالک پر سابق کیمونسٹ ہی جمہوری لبادے میں حکومت کر رہے ہیں اور حزب اختلاف کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ صرف تاجکستان میں عوام نے اسلامی تحریک کی قیادت میں جدوجہد کی ہے تو منصفانہ انتخابات کے لیے معاہدے کی بات چیت ہو رہی ہے۔ یہ ممالک مسلمان ہیں، زبان اور کلچر کے حوالے سے ترکی سے رشتہ رکھتے ہیں۔ ان ممالک سے تعاون کر کے یہ روس کے اثرات سے آزاد ہو سکتے ہیں اور ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

امریکہ اور یورپ کے لیے یہ علاقہ ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکہ وسائل کے حصول اور اپنے مفادات کے تحفظ کے ساتھ ساتھ روس اور دوسرے مغربی ممالک کے اثرات کو بھی کم کرنا چاہتا ہے۔ ایرانی اثرات کو محدود رکھنا بھی اس کا خصوصی ہدف ہے۔

بحیرہ کیسپین (Caspian) میں تیل اور گیس کے اتنے ذخائر ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ سمندر کی تہ میں اللہ کی کیسی کیسی نعمتیں پنہاں ہیں۔ بحیرہ کے گرد روس، ایران، قازقستان، ترکمانستان واقع ہیں۔ نومبر میں ایک وزارتی اجلاس میں طے کیا جائے گا کہ یہ جھیل ہے یا سمندر۔ اگر جھیل ہے جیسا کہ روس اور ایران کا موقف ہے تو ذخائر مشترکہ طور پر نکالے جائیں گے اور اگر سمندر ہے، جیسا کہ آذر

بائیجان، قاز قستان اور ترکمانستان کہتے ہیں تو ہر ایک اپنے حصے سے ذخائر نکالے گا۔ حالیہ جائزوں سے پتا چلا ہے کہ قاز قستان کی طرف کے علاقے میں، ۱۰ بلین ٹن تیل اور ۲ ٹریلین کیوبک میٹر گیس کے ذخائر موجود ہیں۔ (روس کے کل تیل کے ذخائر ۶ء۷ بلین ٹن ہیں) یہ کل ذخائر کا صرف ایک حصہ ہے۔ گیس کے کل ۷ء۵ ٹریلین کیوبک میٹر ذخائر تو معلوم ہیں۔ نامعلوم کا اندازہ ۳۰ ٹریلین کیوبک میٹر ہے۔ (حوالہ: پٹرولیم اکنامسٹ، CIS میں گیس، ص ۳۶) قاز قستان کی صرف ایک تن گیز (Tengiz) آئل فیلڈ میں تیل کے ۲۲ بلین بیرل معلوم ہیں اور ۵۰ بلین کا اندازہ ہے۔ ترکمانستان میں تیل کے ذخائر ۷ء۳ بلین بیرل ہیں۔ ان ذخائر کو دیکھ کر مغرب اور روس کے تیل کے تاجروں کے منہ میں پانی آرہا ہے۔ یہ ذخائر مارکیٹ میں آئیں گے تو سعودی عرب تاریخ کا حصہ بن جائے گا۔

روس کی کوشش ہے کہ تیل اس کے علاقے میں پائپ لائنوں سے گزر کر جائے۔ کوئی ملک اپنے مفادات کے حوالے سے لائن کی تعمیر یا دوسرے سودے کرتا ہے تو روس اسے ناکام بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ترکمانستان نے حال ہی میں پاکستان سے معاہدہ کیا ہے۔

وسط ایشیا کے لیے کراچی کی بندرگاہ قریب ترین ہے۔ اگر افغانستان میں روس کے جانے کے وقت حکمت یار اور ربانی کی حکومت قائم ہو جاتی تو آج اس پورے علاقے کا نقشہ بدلا ہوا ہوتا۔ کشمیر سے بھارت بھی رخصت ہو چکا ہوتا۔

معاہدہ پشاور، جس کے ذریعے جائز حق داروں کو افغانستان میں حق حکومت سے محروم کیا گیا اور غیر اہم گروپوں کو اقتدار دے کر افغانستان کو مسلسل جنگ میں جھونک دیا گیا، دراصل پاکستان کے اپنے اور ملت اسلامیہ کے مفادات سے غداری کے مترادف تھا۔ آج جو کش مکش، فتنہ اور قتل و غارت گری ہے، اسی تاریخی موقع کو گنوانے کا ورثہ ہے۔ یقیناً قوموں کو اپنے قائدین کی غلطیوں کا خمیازہ بڑا سخت بھگتنا پڑتا ہے۔

غزہ کے حکمرانوں کی حرکتیں

مسلم سجاد

کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک طرف اسرائیلی تعمیرات کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہو اور دوسری طرف عرفات کی حکومت کا ایک وزیر جمیل طریفی ان کا ٹھیکہ لے کر تعمیرات کروا رہا ہو۔ ایک طرف سرحد بند ہونے سے عام فلسطینی کو دو وقت کی روٹی کے لیے مزدوری نہ مل رہی ہو، اور دوسری طرف وی آئی پی پلیٹ لگا کر فلسطینی حکومت کے افسران اور وزرا اسرائیل کے نائٹ کلبوں میں آتے جاتے ہوں۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ غزہ کے اس علاقے میں جہاں چند سال قبل ساحل پر ایک نائٹ کلب کو آگ لگا دی گئی تھی، اب زہرۃ المدائن نام کے نائٹ کلب میں جمعہ کی رات کو غزہ کی بیلے ڈانسرز اور مغنیات، بھرے ہال

میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ یہاں کی رونق غزہ کے باشندے نہیں، بلکہ "تیونسی" ہیں جو یاسر عرفات کی حکومت چلانے کے لیے ۱۰ ہزار کی تعداد میں آئے ہیں۔ تیونس سے واپس آنے والے اپنی سرزمین میں محض اجنبی نہیں بلکہ مقامی لوگوں میں نفرت، حقارت اور ذلت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کی نظر میں برطانوی یا اسرائیلی یا مصری حکمرانوں سے مختلف نہیں ہیں۔ یہ اسرائیل سے لڑائی جاری رکھنے کے بجائے اس سے سازباز کر کے رقم سمیٹنے اور عیاشیاں کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ بین الاقوامی امداد کی شکل میں رقم آ رہی ہے اور یہ حکمران کرپشن کے نئے ریکارڈ قائم کر رہے ہیں۔

غزہ کے ایک باشندے نے کہا: "ہر انقلاب کے کچھ جان نثار، کچھ مفکرین اور کچھ منافع خور ہوتے ہیں۔ ہمارے جان نثار ہلاک ہو چکے ہیں، مفکرین کو قتل کیا جا چکا ہے، صرف منافع خور رہ گئے ہیں۔ مقصد ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں، اس کے لیے یہ سوچتے تک نہیں۔ تیونس کی طرح وہ یہاں بھی اپنے کو عارضی سمجھتے ہیں، جب تک ہیں، رقم سمیٹتے رہیں"۔

حالات پر جس کی نظر ہے، اسے یہ تبصرہ غلط نہیں لگتا۔ "آزاد" غزہ کے علاقے میں نہایت تیز رفتاری سے وزارتوں، ایجنسیوں اور تھانوں کے دفاتر کی عمارات تعمیر ہو رہی ہیں۔ یہیں عرفات کا اپنا قصر صدارت ہے اور یہیں اس کے بالکل قریب زہرۃ المدائن ہے۔ یہاں چلتے پھرتے آپ کو عرفات کی بیوی سہا نظر آئیں گی، اپنی شیرخوار بچی، اس کی شراب میں دھت آیا سوسی اور باڈی گارڈز کے ساتھ۔ یا پھر وہ شاپنگ کے لیے پیرس گئی ہوتی ہیں، جہاں ان کی پسند کا ہیر ڈریسر ہے۔

نئے نئے عالی شان محلات میں ۲۰ لاکھ ڈالر سے زائد کا محل ابومازن کا ہے جو اوسلو مذاکرات میں عرفات کا نمایندہ تھا۔ اس پر کسی دل جلے نے لکھ دیا ہے: "یہ فلسطین فروخت کرنے کا تمھارا انعام ہے"۔ منصوبہ بندی کے وزیر نبیل شعطہ نے حال ہی میں اپنی بیٹی کی ہم عمر لڑکی سے شادی کی تو اس کے لیے قاہرہ، غزہ اور یروشلم میں چار تقاریب کیں۔ یروشلم میں اسرائیلی دوستوں کے لیے ایک "خصوصی تقریب" منعقد کی۔

ان عالی شان محلات کے ساتھ ہی مہاجرین کے کیمپ ہیں جہاں غلاظت کے ڈھیر لگے ہیں اور کوئی پرسان حال نہیں۔

عرفات کا کہنا تھا کہ وہ غزہ کو سنگاپور بنا دے گا لیکن تین سال بعد، اس کے کوئی آثار نہیں۔ عرفات غالباً یہ چاہتا بھی نہیں۔ اگر عام خوش حالی آ گئی تو اس کا پولس کا جبر و ظلم کا نظام کیسے چلے گا؟ اس کے اقتصادی مشیروں کے ٹولے نے اجارہ داری قائم کر لی ہے۔ ان کا گٹھ جوڑ ان کو امیر تر اور معاشرے کو غریب تر کیے جا رہا ہے۔ ایک کمپنی البحر قائم کی گئی ہے۔ فلسطینی کہتے ہیں کہ یہ "سمندر" سب کو نگل لے گا۔ عرفات کی بیوی اس کی کرتا دھرتا ہے۔ علاقے میں کوئی کام اس کے "حصے" کے بغیر نہیں ہوتا۔ سمینٹ، پٹرول، آٹا جو کچھ درآمد ہوتا ہے سب میں حصہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ٹن سمینٹ کے ۷۴ ڈالر میں ۱۷ ڈالر حکومت کے ہوتے ہیں اور ۱۷ ڈالر تل ابیب کے بنک میں ذاتی اکاؤنٹ میں جاتے ہیں۔ (ماخوذ: ڈیوڈ ہرسٹ، گارجین، ۲۱ اپریل ۹۷)

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ کی رضا تلاش کرے لوگوں کی ناراضی کے باوجود' اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کی ناراضی کے بوجھ سے بچانے کے لیے کافی ہو گا۔ اور جو لوگوں کی رضامندی تلاش کرے اللہ کی ناراضی کے باوجود' اللہ اسے لوگوں کے حوالے کر دے گا"۔ (ترمذی)

رسائل و مسائل

بلامتن ترجمہ قرآن کی اشاعت

گذشتہ دنوں بلامتن قرآن مجید کا ترجمہ نظر پڑا۔ میرے علم میں تو یہی ہے کہ علما اس طرح ترجمہ کی اشاعت کو منع کرتے ہیں۔ براہ کرم آپ ازروئے شریعت واضح فرمائیں کہ ایسا کرنا کہاں تک صحیح ہے؟

یہ بات معلوم ہے کہ ترجمہ قرآن بلامتن کی اشاعت کا مسئلہ خالص اجتہادی مسئلہ ہے۔ قرآن مجید اور احادیث نبویؐ دونوں اس کے جواز و عدم جواز سے ساکت ہیں۔ اگر ان دونوں میں کسی ایک پہلو کی وضاحت ہوتی تو یہ مسئلہ سوال سے پہلے ہی حل ہو تا۔ اس کے علاوہ جہاں تک میرا مطالعہ ہے جلیل القدر فقہائے امت کی کتابیں بھی اس بحث سے خالی ہیں۔ اب اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ اس مسئلے پر ایک اصولی نظرڈال کر جواب حاصل کیا جائے۔

اصولاً یہ بات مسلم ہے کہ قرآن کی ہدایات و تعلیمات اور اوامرو نواہی اور احکام و قوانین کی واقفیت خود مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہے اور انھیں غیر مسلموں تک پہنچانا بھی امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس بات کو تسلیم کرنے کے بعد دو سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمام دنیا کے وہ مسلمان جو عربی زبان سے نابلد ہیں مضامین قرآن سے کس طرح واقفیت حاصل کریں؟ اس کی تین صورتیں سمجھ میں آتی ہیں۔

۱۔ تمام مسلمانوں پر عربی زبان کی تحصیل لازم قرار دی جائے۔

۲۔ ان کے لیے صرف الفاظ قرآن کی تلاوت کافی سمجھی جائے اور اس کے احکام ہر ملک کی اپنی زبان میں قرآن سے الگ فقہی یا غیر فقہی کتابوں کے ذریعے بتائے اور پڑھائے جائیں۔

۳۔ قرآن مجید کا ہر ملک کی زبان میں حامل المتن ترجمہ کیا جائے اور جہاں جہاں ضرورت ہو، تشریح و تفسیر کردی جائے تاکہ قرآن کی تلاوت کرنے والا غیر عربی داں مسلمان، الفاظ قرآن کے ساتھ ہی اس کے معنی و مطلب سے بھی ایک حد تک واقف ہو جائے۔

پہلی صورت کے لزوم و وجوب کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ دوسری صورت میں غیر عربی داں مسلمان قرآن کے معنی و مطلب سے محروم رہ جاتے ہیں اور قرآن سے ان کے گہرے ربط و تعلق میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے علمائے امت نے تیسری ہی صورت اختیار فرمائی۔ اب اس زمانے میں تو قرآن کے

حامل المتن ترجمے کے عدم جواز کے بارے میں کسی مسلمان کو شاید کوئی شک بھی نہیں گزرتا لیکن کم سے کم ہندستان میں جب قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا تو اس وقت اس کے خلاف عوام و خواص نے سخت احتجاج کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سبھی غیر مخلص اور شرپسند نہ ہوں گے بلکہ بہت سے لوگوں نے اخلاص کے ساتھ اور متوقع خطرات کے پیش نظر ہی اس کی مخالفت کی ہو گی لیکن اس مخالفت کے پیچھے نہ عقلی دلیل تھی نہ نقلی اور متوقع خطرات بھی قابل اعتنا نہ تھے۔ اس لیے وہ ترجمہ مقبول ہوا اور آیندہ بہت سے تراجم کا سنگ میل ثابت ہوا۔

دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ دنیا کے غیر عربی داں غیر مسلموں میں کس طرح قرآن سے دلچسپی پیدا کی جائے جو دین اسلام کا سب سے اعلیٰ ماخذ ہے۔ مسلمانوں کے تعلق سے اوپر جو تین صورتیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے پہلی دو صورتیں یہاں اور زیادہ نامناسب ہیں۔ پہلی صورت یوں صحیح نہیں کہ جب مسلمانوں پر عربی کی تعلیم واجب قرار نہیں دی جا سکتی تو غیر مسلموں پر بدرجہ اولیٰ واجب نہ ہو گی۔ دوسری صورت میں یوں مناسب نہیں کہ حصول اجر و برکت کے لیے الفاظ قرآن کی تلاوت غیر مسلموں کے لیے بے معنی ہے۔ تیسری صورت یعنی متن کے ساتھ ترجمہ قرآن کی اشاعت، البتہ قابل غور ہے۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے غیر مسلموں کے لیے ترجمے کے ساتھ متن قرآن کی اشاعت ضروری نہیں معلوم ہوتی۔ یہ رائے میں نے متعدد وجوہ سے قائم کی ہے۔

(۱) مروجہ حامل المتن تراجم قرآن کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے سب سے پہلے حامل المتن ترجمہ قرآن شائع کیا، ان کے سامنے اصلاً صرف وہ مسلمان تھے جو تلاوت قرآن تو کرتے تھے لیکن یہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ اس کتاب میں کیا کہا گیا ہے۔ وہ قرآن کے معنی و مطلب سے ناآشنا ہوتے تھے اور صرف حصول اجر و برکت کے لیے تلاوت کرتے تھے۔ انھیں اس کتاب الٰہی سے آشنا کرنے کے لیے آیات قرآنی کے بین السطور میں ترجمے شائع کیے گئے تاکہ ایک طرف وہ تلاوت قرآن کے عظیم اجر و برکت سے مستفید ہوں اور دوسری طرف قرآن کے معانی و مطالب سے بھی ایک حد تک واقف ہوں اور ناآشنائے محض نہ رہ جائیں۔ بین السطور ترجمے کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ عربی زبان سیکھنے والے طلبہ الفاظ قرآن کے لفظی ترجمے پڑھ کر عربی کی استعداد بھی بڑھا لیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ کے تقریباً لفظی ترجمے پڑھ کر کچھ اسی طرح کا تاثر ذہن میں قائم ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اصلاً غیر مسلموں کو سامنے رکھ کر حامل المتن ترجمے شائع نہیں کیے تھے کیونکہ جو لوگ الفاظ قرآن پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، ان کے لیے متن قرآن کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر کسی درجے میں بھی ایسے لوگ سامنے ہوتے جو قرآن پڑھنا نہیں جانتے تو بین السطور ترجمے کی کوئی تک سمجھ میں نہیں

آتی۔ اس لیے غیر مسلموں کو قرآن سے آشنا کرنے کے لیے اس صورت پر اصرار کرنا جو قرآن خواں مسلمانوں کے لیے اختیار کی گئی تھی، مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) جس طرح حامل المتن تراجم قرآن کے عدم جواز پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے اسی طرح بلامتن ترجمہ قرآن کی اشاعت کو ناجائز کہنے کے لیے کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے۔

(۳) ترجمے کے ساتھ پورا متن قرآن غیر مسلموں کے ہاتھوں میں دینا احترام قرآن کے پہلو سے بھی نامناسب ہے بلکہ ایک حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ غیر مسلمانوں کے ہاتھ قرآن فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ بات بہتوں کو عجیب معلوم ہو اس لیے وہ حدیث نقل کرتا ہوں: "حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ قرآن ساتھ لے کر دشمن کے ملک میں سفر کیا جائے اس خوف سے کہ کہیں دشمن اسے چھین نہ لے"۔ (متفق علیہ)

محدثین نے تصریح کی ہے کہ اس ممانعت کی علت قرآن کی بے حرمتی کا خوف ہے۔ اگر یہ خوف نہ ہو تو دشمن ملک میں بھی قرآن ساتھ لے کر سفر کیا جا سکتا ہے۔ اسی حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا ہے کہ غیر مسلموں کے ہاتھ قرآن نہ فروخت کیا جائے۔ چنانچہ اس حدیث کے تحت حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: "اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ کافر کو قرآن کی فروخت ممنوع ہے کیونکہ یہاں بھی مذکورہ علت موجود ہے۔ اس صورت میں بھی کافر کو بے حرمتی کرنے پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس بیع و فروخت کے حرام ہونے میں اختلاف نہیں ہے۔ ہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر ایسا ہو تو بیع واقع ہو گی یا نہیں اور قرآن سے کافر کی ملکیت دور کرنے کا حکم دیا جائے گا یا نہیں؟" (فتح الباری ج ۶، ص ۸۲)

اس فقہی حکم کی موجودگی میں غیر مسلموں کے لیے ترجمے کے ساتھ پورا متن قرآن شائع کرنا کس طرح مناسب قرار دیا جائے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کو قرآن دیا جا سکتا ہے اور دلیل میں اس فرمان نبویؐ کو پیش کرتے ہیں جو آپ نے ہرقل کو بھیجا تھا کیونکہ اس میں قرآن کی آیت بھی درج تھی۔ شاید ایسے لوگوں کی نگاہوں سے مذکورہ بالا حدیث اوجھل ہو جاتی ہے اور وہ اس فرق کو بھی محسوس نہیں کرتے جو پورے قرآن اور کسی خط میں دو ایک آیتوں کے حوالے میں ہے۔ فقہاے امت نے اس فرق کو محسوس کیا ہے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں: "اور علما کا اس پر اتفاق ہے کہ غیر مسلموں کو ایسا خط لکھنا جائز ہے جس میں قرآن کی ایک یا چند آیتیں درج ہوں اور اس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان ہے جو آپؐ نے ہرقل کو بھیجا تھا"۔ (شرح مسلم)

اس کے علاوہ عام طور پر کسی غیر مسلم کو قرآن دینے اور سفارتی سطح پر کسی غیر مسلم حکومت کو قرآن یا قرآن کی بعض آیتیں بھیجنے میں بڑا فرق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس فرمان سے استدلال کیا جاتا ہے

اس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ہرقل نے اس کی بڑی عزت کی تھی اور بڑے اعزاز کے ساتھ حضورؐ کا وہ فرمان بہت دنوں تک اس کے خزانے میں محفوظ رہا۔

اس بحث کے بعد اب میں ان لوگوں کے خیالات کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں جو غیر مسلموں کے لیے بھی صرف ترجمے کی اشاعت کو ناجائز کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو سب سے بڑی دلیل دی جاتی ہے وہ یہ اندیشہ ہے کہ اگر بلامتن ترجمے رائج ہو گئے تو دیگر کتب سماوی کی طرح قرآن کا متن بھی نعوذ باللہ دنیا سے غائب ہو جائے گا اور صرف تراجم باقی رہ جائیں گے۔ قرآن کے بارے میں یہ اندیشہ میرے نزدیک وہم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس اندیشے میں پہلی بات تو یہ نظرانداز ہو گئی ہے کہ صرف انگریزی یا صرف ہندی کے ترجمے اصلاً غیر مسلموں تک قرآن کی تعلیمات پہنچانے کے لیے شائع کیے جا رہے ہیں اس لیے مسلمانوں کے درمیان صرف تراجم کے رائج ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ دوسری بات جو پہلی بات سے زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ اس معاملے میں قرآن اور دیگر کتب سماوی کو ایک قرار دے لیا گیا ہے حالانکہ تمام انسان مل کر بھی قرآن کو دنیا سے غائب کرنا چاہیں تو ہرگز قادر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ قرآن کو قیامت تک دنیا میں باقی رکھنے بلکہ امت مسلمہ میں سے ایک ایسے گروہ کو باقی رکھنے کی ذمہ داری لی ہے جو خود قرآن پر عمل کرتا رہے گا، دنیا کو اس کی طرف دعوت دیتا رہے گا اور تمام معنوی تحریفات کو باطل کرتا رہے گا۔

پریس کی اس ترقی کے زمانے میں قرآن دنیا بھر میں کروڑوں کی تعداد میں شائع ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا، لاکھوں سینوں میں قرآن محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا۔ اس کے علاوہ دیگر سائنسی ذرائع اور وسائل ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو متن قرآن کی حفاظت کے لیے بھی استعمال کیے جا رہے ہیں اور کیے جائیں گے۔ یہاں اس بات کی طرف صرف اشارہ مقصود ہے۔ حفاظت قرآن کے تمام ذرائع و وسائل کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔

دوسری دلیل جو دی جاتی ہے وہ یہ اندیشہ ہے کہ اگر متن سامنے نہ ہو تو تحریف معنوی کی بڑی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔

یہ عجیب اندیشہ ہے جو فہم سے بالاتر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا متن کی موجودگی میں تحریف معنوی نہیں کی جا سکتی اور کیا متن کے ساتھ ساتھ تحریف کی مثالیں آج بھی موجود نہیں ہیں؟ اس کے علاوہ متن کی موجودگی میں بھی غلط ترجموں کی گرفت تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عربی سے واقف ہوں اور اس زبان سے بھی جس میں ترجمہ کیا گیا ہے اور یہاں ترجمہ بلامتن کی اشاعت ان لوگوں کے لیے ہے جو عربی سے تو کیا واقف ہوں گے، قرآن پڑھ بھی نہیں سکتے۔ ایسے لوگوں کے لیے متن کی موجودگی، تحریف معنوی سے رکاوٹ کس

طرح بن جائے گی؟ اس سے بچنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ متن بھی لازماً شائع کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ خدا کا خوف رکھنے والے لوگ پوری احتیاط اور جانچ پڑتال کے بعد تراجم شائع کریں۔

ایک اندیشہ یہ ہے کہ صرف ترجمے کی اشاعت سے الفاظ قرآن سے بے توجہی پیدا ہو گی اور اس کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ یہ اندیشہ بھی صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے امید یہ ہے کہ وہ ترجمہ پڑھ کر اصل قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کی اہمیت ان کے دلوں میں قائم ہو گی۔ آج ان کے دل اس کی اہمیت سے اس لیے خالی ہیں کہ وہ نہیں جانتے کہ قرآن میں کیا ہے، جب انھیں معلوم ہو گا کہ اس کتاب میں ایسے حقائق بھرے ہوئے ہیں جن کی انسان کو سب سے زیادہ ضرورت ہے تو فطری طور پر وہ قرآن کی عظمت و اہمیت کے قائل ہو جائیں گے۔ باقی رہے وہ مسلمان جو قرآن پڑھنا نہیں جانتے تو انھیں بھی ترجمہ پڑھ کر قرآن کی طرف توجہ ہو گی اور اس کے الفاظ سیکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا ہو گا۔ غرض یہ ہے کہ محض کسی ایسی کتاب سے جس میں قرآن کا متن بھی ہو اور ترجمہ بھی، الفاظ قرآن کی اہمیت پیدا نہیں ہوتی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان اندیشوں میں سے کوئی اندیشہ ایسا نہیں ہے جو ترجمہ بلامتن کی عدم اشاعت کے لیے دلیل بن سکے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میرے نزدیک خصوصیت کے ساتھ غیر مسلموں کی ضرورت و طلب کے پیش نظر ترجمہ بلامتن شائع کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ (سید عروج احمد قادری)

رسول اللہؐ نے سفر میں سنتیں بھی پڑھی ہیں

سفر میں بعض لوگ منزل مقصود پر پہنچ جانے کے بعد بھی صرف فرض نمازیں ادا کرتے ہیں، فرض نمازوں سے پہلے یا اس کے بعد جو سنتیں ہیں وہ نہیں پڑھتے۔ ہم لوگ سنتیں بھی پڑھتے ہیں۔ ایک بار بعض ایسے لوگوں سے جو مسافرت میں سنتیں نہیں پڑھتے، پوچھا گیا کہ کیوں نہیں پڑھتے تو انھوں نے جواب دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں سنتیں نہیں پڑھی ہیں۔ اگر واقعہ یہی ہے کہ آپؐ نے سفر میں سنتیں کبھی نہیں پڑھی ہیں تب تو ہم لوگوں کا عمل خلاف سنت ہے۔ مہربانی کر کے احادیث کے حوالوں کے ساتھ واضح کیجیے کہ واقعہ کیا ہے؟

احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافرت میں سنتیں بھی پڑھی ہیں۔ میں ذیل میں چند احادیث کے ترجمے پیش کرتا ہوں۔

(۱) "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری و مسلم اور نسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے سفر میں بھی فجر کی دو سنتیں کبھی ترک نہیں کی ہیں"۔

(۲) "حضرت عبداللہؓ بن عمر سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضر و سفر دونوں میں نمازیں پڑھی ہیں تو میں نے آپؐ کے ساتھ حضر میں ظہر کے چار فرض کے بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ اسی طرح سفر میں ظہر کے دو فرض کے بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں اور عصر کی دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے اور کوئی نماز نہیں پڑھی اور آپؐ کے ساتھ مغرب کی نماز حضر و سفر دونوں میں تین رکعتیں پڑھی ہیں اور اس میں حضر و سفر میں کمی نہیں ہوتی اور یہ وتر النہار ہے اور فرض مغرب کے بعد دو رکعتیں پڑھی ہیں"۔ (ترمذی باب ماجاء فی التطوع فی السفر)

(۳) "عطاء سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ مکہ میں جمعہ کے فرض کے بعد اپنی جگہ سے ذرا اور آگے بڑھ کر دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ پھر ذرا اور آگے بڑھ کر چار رکعتیں پڑھتے تھے اور جب وہ مدینے میں ہوتے تھے تو نماز جمعہ کے بعد اپنے گھر واپس آکر دو رکعتیں پڑھتے اور مسجد میں نہیں پڑھتے تھے۔ جب اس کے بارے میں ان سے پوچھا گیا تو کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح کرتے تھے"۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ)

(۴) "حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جب تطوع (فرض کے علاوہ کوئی دوسری نماز) کا ارادہ فرماتے تھے تو اپنی اونٹنی کے ساتھ قبلہ رو ہو کر تکبیر تحریمہ کہتے تھے پھر نماز پڑھتے تھے خواہ اونٹنی کا رخ اب کسی طرف ہو"۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ)

(۵) "حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ میں اٹھارہ سفروں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا ہوں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے آفتاب ڈھلنے کے بعد کی دو رکعتیں ترک کی ہوں"۔ (ترمذی، ابوداؤد)

ان احادیث میں فجر سے پہلے کی سنتوں اور نماز ظہر و مغرب کے بعد کی سنتوں اور ان کے علاوہ نماز جمعہ کے بعد کی سنتوں کی صراحت ہے۔ نماز ظہر سے پہلے اور نماز عشاء کے بعد کی سنتوں کی صراحت ابھی مجھے نہیں مل سکی ہے لیکن حضرت عائشہؓ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے کی چار رکعتوں اور اس کے بعد کی دو رکعتوں کو کبھی ترک نہیں فرماتے تھے۔ اگرچہ اس حدیث میں حالت سفر کی صراحت نہیں ہے لیکن اس کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ ہم حالت سفر کو مستثنیٰ کر دیں۔ جب حضورؐ زوال کے بعد کی دو رکعتیں سفر میں بھی ترک نہیں فرماتے تھے جیسا کہ اوپر حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث میں گزر چکا تو قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ آپؐ ظہر سے پہلے کی سنتوں کو بھی ترک نہ فرماتے ہوں گے۔ اسی طرح آپ کے معمولات سفر کو دیکھتے ہوئے اس کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ عشاء کے بعد کی

سنتوں کو سفر میں ترک کر دیتے ہوں گے۔ جس ذات گرامی کا حال یہ ہو کہ اثنائے سفر میں اونٹنی کی پیٹھ پر بھی نمازوں میں مشغول رہتی ہو' وہ منزل مقصود پر پہنچ کر سنن موکدہ کس طرح ترک کر دے گی۔ بہرحال اوپر جن احادیث کے ترجمے پیش کیے گئے ہیں ان سے بغیر کسی اشتباہ کے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں بھی سنتیں پڑھتے تھے۔

آپ کا جواب ختم ہوا لیکن اخیر میں اس کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں سنتیں نہیں پڑھی ہیں' اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا ہے۔ آپ صرف فرض ادا فرماتے تھے۔ فرض سے پہلے اور اس کے بعد کی سنتیں نہیں پڑھتے تھے اور یہی عمل ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کا بھی تھا۔ ان کی اس حدیث سے بعض لوگوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا کہ انھوں نے یہ بات مطلقاً کہی ہے۔ حالانکہ انھوں نے اثنائے سفر میں نماز کے بارے میں یہ بات کہی تھی۔ سفر کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی ابھی قطع مسافت کر رہا ہو اور منزل مقصود پر نہ پہنچا ہو اور دوسری یہ کہ جہاں جانا چاہتا تھا' وہاں پہنچ چکا ہو۔ حضرت ابن عمرؓ نے اس حدیث میں جو بات کہی ہے اس کی مراد یہ ہے کہ اثنائے سفر میں جب کہ سفر جاری ہو' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین سنتیں نہیں پڑھتے تھے لیکن منزل مقصود پر پہنچ جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنتیں پڑھی ہیں اور حضرت ابن عمرؓ بھی پڑھتے تھے جو اس حدیث کے راوی ہیں۔ (ع-ا-ق)

کتاب نما

Islam and Western Civilization (اسلام اور مغربی تہذیب)' اقبال ایس حسین۔ ناشر: ہیومینٹی انٹرنیشنل' پوسٹ بکس نمبر ۶۰۳۶' لاہور۔ صفحات: ۳۳۳۔ قیمت: ۳۵۰ روپے۔

اسلام اور عیسائیت کے درمیان گذشتہ پندرہ صدیوں میں سیکڑوں معرکے ہوئے۔ صلیبی جنگوں اور نوآبادیاتی نظام کے اثرات نسل در نسل محسوس کیے جاتے رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں جنگِ عظیم اول و دوم' روس کے انقلاب اکتوبر اور زوال اشتراکیت کے اثرات براہ راست مختلف قوموں اور عالم انسانیت پر مرتب ہوئے۔ اکیسویں صدی کے عین آغاز سے قبل' خاتمہ تاریخ اور تہذیبی تصادم جیسے نظریات نے ذرائع ابلاغ کے ذریعے شہرت پائی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ آنے والے زمانے میں مذاہب (خصوصاً اسلام) کو شدید ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس صورت حال میں ایک ایسی جامع تحریر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس میں نہ صرف جدید نظریات کا خالص علمی انداز میں جائزہ لیا جائے بلکہ سرمایہ داری اور مادہ پرستی کے جو اثرات امریکی اور یورپی معاشرے پر مرتب ہو رہے ہیں' ان پر بھی قلم اٹھایا جائے۔

زیرنظر کتاب کے مصنف تہذیب و تاریخ اور سیاسیات و عمرانیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعے اور یورپ خصوصاً برطانیہ اور جرمنی میں تین عشروں تک اپنے قیام کے بعد جو نتائج اخذ کیے' انھیں زیرنظر کتاب میں سمو دیا ہے۔ ان کی فکر و سوچ کا انداز تحقیقی و تجزیاتی ہے اور جس بات کو وہ صحیح (یا غلط) سمجھتے ہیں' اس کے لیے دلائل و براہین پیش کرتے ہیں۔ ان کی فکر کا ماخذ اسلام کی روشنی اور انسانیت سے محبت ہے۔

چار مرکزی موضوعات کے گرد پھیلے ہوئے تیرہ ابواب میں مصنف نے اسلام کی دعوت' مغربی افکار و نظریات اور مغربی معاشرے کے اپاہج پن پر جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ فکروفن کی دنیا میں کوئی تحریر حرفِ آخر نہیں ہوتی تاہم اس کتاب کو اسلام کے بارے میں مغربی سوچ اور رویوں کا ایک جامع مطالعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

باب اول: انبیاؑ (خصوصاً سید الانبیاؐ) کے پیش کردہ عالمی نظام کے خدوخال' (یہاں دور خلفاے راشدین کی عدم شمولیت کھٹکتی ہے)۔ باب دوم: مذہب و سائنس۔ باب سوم: اسلامی بنیاد پرستی۔ مصنف نے یہ

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اور دہشت گردی میں بعد المشرقین ہے۔ اس باب میں مصنف نے اسلام کے بارے میں مغرب کی غلط فہمیوں اور مسلمانوں کے خلاف اس کے معاندانہ رویے کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ ان کا یہ سوال بہت اہم اور بجا ہے کہ مغرب، زوال اشتراکیت سے پہلے افغانستان اور کشمیر میں مسلم جہادی تحریکوں کا موید تھا، مگر اب اسے ایسی تحریکوں میں دہشت گردی کیوں نظر آتی ہے؟ پھر یہ کہ بوسنیا میں خود مغرب کا کیا رویہ رہا ہے؟ باب چہارم: خطبہ حجتہ الوداع کے نکات (ان کو پہلے باب میں شامل کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا)۔ باب پنجم: مغربی تعلیم، اسلامی تشخص کے لیے ایک چیلنج۔ مسلمانوں کی تعلیمی خدمات۔ باب ششم: اسلام اور تصوف۔ باب ہفتم: مقصد تخلیق جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب ہشتم: نو آبادیاتی نظام۔ یہ باب انتہائی دلچسپ ہے۔ مصنف نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیگر ممالک کو غلام بنانے اور ان کے عوام کو بدترین ایذا پہنچانے کا سہرا (مسخ شدہ) عیسائیت کے سر ہے۔ مصنف نے چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقا پر بھی منطقی روشنی ڈالی ہے۔ باب نہم: مغربی تہذیب، یہ بھی اس کتاب کا ایک اہم حصہ ہے تاہم یہ کہنا کہ سرمایہ داری مغرب کا نیا مذہب ہے، غلط ہے کیونکہ مسیحؑ کی تعلیمات کو بگاڑنے اور دوزخ شکم بھرنے کے لیے نئے نئے افکار و نظریات کی اختراع کوئی نیا کام نہیں ہے۔ مغرب میں ہر بات پر اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن مادہ پرستی کی غالب حیثیت اور اس کے نظریہ زندگی ہونے پر کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور اسی چیز کو انھوں نے انسانی حقوق اور خوش حال زندگی کے پردوں میں چھپا رکھا ہے۔

باب دہم: عالمی تہذیبوں کا باب مختصر ہے۔ اس موضوع پر قدرے تفصیلی گفتگو اس کتاب کو زیادہ وقیع بنا دیتی۔ گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں ابواب کے موضوعات: مغرب میں اسلام کا ورثہ، اسلام اور ریاست اور حقائق اسلام کا انکشاف ہیں۔ آخر میں بعض نامور نومسلموں کے قبول اسلام کی وجوہ واحد متکلم میں دی گئی ہیں اور سب سے آخر میں تاریخ اسلام کے اہم واقعات کا سنین وار خاکہ ہے۔ تہذیبی مباحث میں تشدد، انتہا پسندی، تہذیب کا زندگی سے تعلق، نظریہ زندگی اور معاشرہ اور تصور آخرت کے زندگی پر اثرات پر درمیانے درجے کی بحث ہے۔ مصنف نے پروفیسر ہنٹنگٹن کے تہذیبی تصادم کے نظریے کو رد کیا ہے۔ اقبال ایس حسین لکھتے ہیں: "ماضی میں دوسری قوموں کا معاشی اور سیاسی استحصال ہوتا رہا ہے اور مستقبل میں بھی یہی چیز سرفہرست رہے گی۔ مستقبل میں جو تنازعات سر اٹھائیں گے ان کے لیے سائنس، ٹیکنالوجی، ماحول اور انسانی حقوق کے ہتھیار استعمال کیے جائیں گے۔ بوسنیا، وسطی ایشیا اور شمالی افریقہ کی تہذیبی یکجائی کو نسلی اختلاف نے پارہ پارہ کر دیا اور ہارورڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر کا نظریہ غلط ثابت ہو گیا"۔

مصنف نے اسلام اور عیسائیت و یہودیت کے مابین مشترکہ نکات کی وضاحت بھی کی ہے۔ تعارف میں لکھا ہے کہ میں نے مشرق (بہ معنی اسلام) اور مغرب (بہ معنی الحاد و عیسائیت) کے درمیان مکالمے کا آغاز کر

دیا ہے۔ یہاں اسلامی احیائی تحریکوں کا تذکرہ بھی آ جاتا تو بہتر تھا۔ مصنف نے کتاب کو ایک عمدہ اور سلیس انداز بیان' استدلال اور مغربی افکار ہی سے استنباط کے ذریعے ایک قابل قدر علمی تحریر بنا دیا ہے۔ اقبال ایس حسین نے نہ صرف انگریزی دان طبقے بلکہ غیر مسلم دانش وروں کے لیے بھی ممکنہ مکالمے اور اسلام کے بارے میں غور و فکر کا راستہ کھولنے کی جاندار کوشش کی ہے۔ ہمیں ان کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ مغرب نے' جس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی' وہ مذہب اسلام ہے' حالانکہ دورِ حاضر میں عالمِ انسانیت کے لیے اسلام کی معنویت مسلم ہے۔

علما' محققین' دانش وروں' قانون کے طلبہ اور سیاسیات و ابلاغ سے وابستہ افراد' نیز تہذیب کے موضوع پر کام کرنے والے طلبہ کے لیے یہ ایک نادر تحفہ ہے۔ معیار طباعت بہت عمدہ ہے۔ (محمد ایوب منیر)

پل صراط' اللہ بخش کلیار۔ مطبع: نیو فائن پرنٹنگ پریس ۷۶ لٹن روڈ' لاہور۔ صفحات: ۳۵۰۔ قیمت: درج نہیں ہے۔

مصنف کا تعلق پنجاب کے ایک (سرکاری طور پر) پس ماندہ ضلع' جھنگ کے ایک دور افتادہ گاؤں "کلیاروالا" سے ہے۔ وہ سول سروس میں ایک اچھے' اونچے منصب پر فائز ہیں اور جیسا اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دردمند' دیانت دار اور باضمیر انسان ہیں۔ (حالانکہ افسر شاہی میں داخل ہونے اور بااختیار منصب پر فائز ہونے کے بعد بسااوقات ضمیر کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔) احساس و ضمیر نے ان کے اندر خدمت خلق کے جذبے کو تحریک دی اور انھوں نے اپنے پس ماندہ گاؤں سے قریبی قصبے تک' ایک سڑک اور نہر پر ایک پل کی تعمیر کے لیے دوڑ دھوپ شروع کی۔ یہ ان کی زندگی کا اہم ترین خواب تھا جو کئی برسوں پر پھیلی ہوئی طویل اور ان تھک تگ و دو اور مخالف و بے ایمان عناصر اور مزاحم و بدعنوان قوتوں سے کش مکش کے بعد بالآخر شرمندۂ تعبیر ہوا۔ سڑک بھی بنی' پل بھی بنا' علاقے کو تعلیم' رسل و رسائل اور علاج معالجے کی بہتر سہولتیں میسر آئیں۔ "ہمارا علاقہ جو متحرک زندگی سے بالکل الگ تھلگ اور کٹا ہوا تھا' قومی زندگی کے دھارے میں شامل ہو گیا۔ میری نہایت معمولی زندگی کا یہ ایک نہایت معمولی واقعہ ہے۔ پل صراط سے گنہگار کا رینگ رینگ کر گزر جانے کا سا"۔ مصنف کے نزدیک یہ ایک طرح کا "روحانی سفر" تھا جسے انھوں نے وطن عزیز کی سیاسی' معاشی اور اقتصادی صورت حال کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ایک طرح سے ہمارے معاشرے کی پچاس برس کی تاریخ ہے اور ہماری زندگی کے سیاسی' اقتصادی اور مذہبی مسائل اور ان کے نتیجے میں پیش آمدہ المیوں کا تجزیہ بھی۔

مصنف کے ہاں مظلوم طبقوں' بطور خاص دیہی عوام کی ذلتوں' خواریوں' محرومیوں اور مایوسیوں کا

احساس اور شکوہ نہایت شدید ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بڑے شہر روزگار' علم و دانش اور تعلیم کے مراکز ہیں' اور وہاں سہولتوں اور مواقع کا ارتکاز ہے مگر دیہی آبادی ان مراکز سے دور ہمہ نوع محرومیوں کی دلدل میں ڈوبی اور جہل مرکب کی پستیوں میں گری ہوئی ہے۔ مقامی حکومت' اسمبلیوں اور پارلیمنٹ یا بالاتر ایوانوں میں ان کی خاطر خواہ اور حقیقی نمایندگی نہیں ہوتی۔ ایک فی صد مترف طبقہ اپنی دولت کے بل بوتے پر ۹۹ فی صد "غلام" لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہے' جس سے انسان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجات دلائی تھی۔ انھوں نے شہری زندگی کے سلگتے ہوئے مسائل اور بدعنوانی کے گوناگوں طور طریقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ: "پاکستان میں زیادہ تر سیاسی خاندان' معاشی قوتوں یا مذہبی سلسلوں پر پروان چڑھتے ہیں۔ بعد میں وہ نوکر شاہی کو شریک کار اور رشتے دار بنا لیتے ہیں" اور یہ کہ "پاکستان' مراعات یافتہ اور کرپٹ افراد کے لیے جنت بنا دیا گیا ہے جب کہ عام آدمی کے لیے دوزخ"۔

جاگیرداروں اور وڈیروں کی چیرہ دستیوں' حکمرانوں اور سیاست دانوں کی بدعنوانیوں اور نوکر شاہی کی لوٹ مار کے بارے میں گذشتہ ۳۰' ۴۰ برسوں میں متعدد کتابیں چھپی ہیں۔ کلیار صاحب کی زیر نظر کتاب قدرے مختلف انداز کی ہے۔ ان کے ہاں واقعات اور اعداد و شمار کے بجائے تاثر اور تجزیے کا پہلو غالب ہے۔ مصنف کی دردمندی اور سوز دل نے' اس کے بیس سالہ ملازمتی اور مشاہداتی تجربے کو ایک ایسی تحریر کا روپ دیا ہے جو "دکھے ہوئے دلوں کی' فریاد یہ صدا ہے" بن گئی ہے۔ مگر مصنف کے اس "دہقانانہ احتجاج" میں خیالات و تاثرات کی تکرار بعض اوقات کھٹکتی ہے۔

کلیار صاحب کے متلاطم خیالات اور دراز گفتاری نے اس "سڑک بیتی" میں جگ بیتی اور پاکستان بیتی کے ساتھ ساتھ آپ بیتی کا عنصر بھی شامل کر دیا ہے۔ کچھ اپنا اور اپنے خاندان کا ذکر ہے' پھر واجب الاحترام اساتذہ کا' پھر بعض نہایت دیانت دار' معاملہ فہم اور مثالی دوستوں اور افسروں کی خوبیوں کا' بیرون ملک کے بعض سفر (سفر عمرہ) پھر حسب حال قرآنی آیات و احکام' اقبال کے اشعار' اردو' پنجابی اور انگریزی شاعری ---- اور جو کمی رہ گئی' اسے رنگین تصاویر اور بعض مراسلوں' اخباری تراشوں کے عکوس نے پورا کر دیا ہے۔ مزید برآں سیف اللہ خالد کی دو طویل نظمیں جو موضوعات کتاب کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ و عکاسی کرتی ہیں۔

کلیار صاحب نے مقامی خود کفالت اور معاشی ترقی و خوش حالی پر زور دیا ہے' بلاشبہ یہ ضروری ہے مگر اصلاح احوال کے لیے دین کے حقیقی شعور' روایات کی قدر و قیمت' حق و ناحق کی تمیز اور ضمیر کی بیداری و زندگی بہ الفاظ دیگر ایمان و ایقان کی ایک مستحکم کیفیت کے بغیر' یہ پلازے' ییلو کیب' موٹر وے حتیٰ کہ "ٹائیگر" بن جانے سے بھی زندگی میں کوئی پائدار اور بنیادی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اسے آپ اصلاح قلب

کہیں یا تزکیہ نفس یا تقویٰ۔۔۔۔ مگر انسانیت کی فلاح اسی پر منحصر ہے۔

کلیار صاحب کے احساسات بہت شدید مگر فطری ہیں، خوش آیند امر یہ ہے کہ خرابی کے ذمہ دار قابض طبقوں کے خلاف، ان کے ہاں کسی طرح کا انتقامی جذبہ مفقود ہے، بلکہ وہ مظلوموں کے ساتھ ظالموں کے لیے بھی دعاگو ہیں: "حضور اکرمؐ کے حکم کے مطابق، یہ صفحات بطور خاص، ظالم بھائیوں کی مدد کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں" (انتساب کی عبارت)۔ کتاب اچھے معیار طباعت پر شائع ہوئی ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

لہو کے چراغ، ظہور الدین بٹ۔ ناشر: کشمیر انٹرنیشنل، رحمن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۵۲ روپے۔

مقبوضہ کشمیر کی موجودہ صورت حال بھارتی سامراج کے ظالمانہ تسلط اور بہیمیت کا کھلا ثبوت ہے۔ گذشتہ چھ سالوں سے کشمیری نہتے عوام اپنی بقا اور اسلام کی سربلندی کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ یہاں ہر روز نئی کہانیاں جنم لیتی ہیں اور ایثار و قربانی، وطن کی محبت، اور سرفروشی و جانثاری کے حیران کن واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ یہ جذبہ ہے یا آگ ہے یا جنون یا اقبال کی اصطلاح میں "عشق"۔ تاریخ اسلام ایسے بے شمار چشم کشا واقعات اور ایمان افروز داستانوں سے بھری پڑی ہے جو محض جذبہ عشق کے بل بوتے پر وجود میں آئیں۔ مجاہدوں اور جان نثاروں کے خون کا حق ہے کہ انھیں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے ورنہ بقول نسیم حجازی ہمارا انجام بھی کہیں اندلس جیسا نہ ہو۔ "میرے نزدیک اندلس کے مسلمانوں کا المیہ صرف یہ نہیں کہ وہ اپنی سلطنت، اپنی آزادی اور اپنے وطن اور اپنے قومی تشخص سے محروم ہو گئے تھے اور ایک پرشکوہ ماضی سے ان کے سارے رشتے کاٹ دیے گئے تھے، بلکہ ایک عظیم سانحہ یہ بھی ہے کہ ہمیں ان پر انکوی زیشن کے ناقابل بیان مظالم کے تذکرے، جن کے باعث وہ ایک صدی کے عرصے میں اندلس سے نابود ہو گئے تھے، بیشتر یورپ کے عیسائی مورخین کی تصانیف سے ملتے ہیں"۔

اس المیے کے پیش نظر "لہو کے چراغ" جیسی کتب بہت اہم اور قیمتی ہیں۔ اس میں مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے مظالم، حریت پسندوں کی کوششوں کے مختلف پہلوؤں پر کہانیوں اور واقعات کی صورت میں روشنی ڈالی گئی ہے، جناب ظہور الدین بٹ کی یہ کاوش قابل داد ہے۔ کہانیوں کا انداز سادہ ہے، ہر کہانی واقعے کے انداز میں شروع ہوتی ہے مگر ان میں رسمی اور روایتی افسانے کا سا اتار چڑھاؤ نہیں ہے، اسی طرح واقعاتی ترتیب، کلائمکس اور ڈرامائی تغیر جیسے عناصر بھی آپ کو نہیں ملیں گے۔ البتہ یہاں کشمیر کے گھر گھر میں شب و روز رونما ہونے والی داستاں کو قلم بند کیا گیا ہے۔

اگرچہ حریت پسندوں کی جہادی سرگرمیوں کو مناسب انداز میں بیان کیا گیا ہے تاہم چونکہ پوری کتاب میں واقعات کا یہی انداز ہے' اس لیے ایک ایسا قاری جو تاریخی نقطہ نظر سے ہٹ کر محض کہانی کے لیے ان کا مطالعہ کرے' وہ قدرے بوریت محسوس کر سکتا ہے--- کیونکہ واقعہ کیسا ہی کیوں نہ ہو' جب تک اس کو ادبی اور فنی جہت نہ دی جائے' وہ بیشتر قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں کرپاتا۔ بایں ہمہ یہ کہانیاں دلچسپ' قابل مطالعہ اور اثر انگیز ہیں۔ (زبیدہ جبیں)

فی ظلال القرآن' جلد پنجم' سید قطب۔ ترجمہ: سید معروف شاہ شیرازی۔ ناشر: منشورات اسلامی' بالمقابل منصورہ' ملتان روڈ' لاہور۔ صفحات: ۴۸۷۔ قیمت: ۳۷۵ روپے۔

سید قطب شہید کی شہرۂ آفاق تفسیر قرآن کے اردو ترجمے کی پانچویں جلد پیش نظر ہے۔ سید معروف شاہ شیرازی کی ترجمہ کردہ چار جلدیں پیشتر ازیں چھپ چکی ہیں (ان کا ذکر "کتاب نما" میں ہوتا رہا ہے)۔ سپارہ ۲۰ تا ۲۶ کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل یہ جلد بھی اسی انداز و اسلوب میں شائع ہوئی ہے۔ خوش آیند امر یہ ہے کہ ضخامت کے مقابلے میں ہدیہ بہت کم ہے--- آخری جلد باقی ہے--- امید ہے' وہ بھی جلد شائع ہو گی۔ (ر-ہ)

نماز کی عربی سیکھیے' زید طفیل شیخ۔ ناشر: ادارہ تعمیر انسانیت' حاجی پور' ضلع راجن پور۔ صفحات: ۶۵۔ قیمت: ۲۴ روپے۔

نماز ایک تذکیر ہے اور خدا کے حضور عجز و نیاز مندی کے اظہار کا عمل ہے۔ اس لیے نماز کو سوچے سمجھے بغیر پڑھنا' چند رٹے رٹائے کلمات ادا کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک طرح کی غفلت ہے اور بہرحال مستحسن نہیں ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں عربی زبان سکھانے اور بالخصوص نماز کی عربی سکھانے کے لیے جدید اسلوب میں ایک اچھی کاوش کی گئی ہے۔ روایتی طریقے سے ہٹ کر عام فہم اور تعلیم کا براہ راست انداز اپنایا گیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اگر دینی مدارس میں صرف و نحو سکھانے کے لیے اس طریقے کو اپنایا جائے تو طلبہ بہ آسانی اور جلد عربی سیکھ سکیں گے۔ خوش نما سرورق کے ساتھ کتاب پندرہ اسباق یا ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے چودہ اسباق میں عربی گرامر عام فہم انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پندرھواں سبق "نماز اور چھوٹی سورتوں" کے ترجمے پر مشتمل ہے جس میں گرامر کے نکات بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بقول مولف: "کتاب کے اسباق کی ترتیب اس انداز سے کی گئی ہے کہ ان شاء اللہ اس کی بنیاد پر مستقبل میں مزید

عربی سیکھنا آسان ہو جائے گا"۔ (امجد عباسی)

مغرب اور اسلام (سہ ماہی)، ادارت: ڈاکٹر انیس احمد، خالد رحمٰن، سجاول خان رانجھا۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، بلاک ۱۹، مرکز ایف سیون، اسلام آباد۔ صفحات: ۴۸۔ قیمت: ۲۵ روپے۔

اسلام کے بارے میں مغرب کا رویہ عالمی سطح پر محض ایک سیاسی موضوع نہیں ہے، بلکہ اس کی جڑیں فکری اور مذہبی اعتبار سے بھی بڑی گہری ہیں۔ اس کش مکش کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اہل مغرب نے مذہبی منافرت، سیاسی عدم دیانت، علمی بددیانتی اور جنگی وحشیانہ پن کا نشانہ مسلم دنیا کو بنایا۔

مغرب کے ذہن کا مطالعہ کرنے کے لیے جرمن، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور انگریز مستشرقین کی تحریریں بڑی اہم ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں مغربی زبانوں سے عمومی بے تعلقی نے، مغرب میں اٹھنے والے فکری تعصبات کا ادراک دشوار بنا دیا ہے۔ البتہ سابق برطانوی نوآبادیاتی علاقوں میں رہنے والے ہم جیسے افراد انگریز مستشرقین تک رسائی پا سکتے ہیں، (اور کچھ افریقی سابق نو آبادیات کی پہنچ فرانسیسی تک بھی ہے) لیکن اس میں بھی افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ انگریزی سے ناتا رکھنے کے باوجود ہم عام طور پر، اسلام اور مسلم دنیا کے بارے میں لکھی ہوئی انگریزی تحریروں تک رسائی میں ناکام ہیں۔ انگریز، انگریزی اور امریکہ کی عمومی تابع داری کے باوجود ہمارا دانش ور اور روشن خیال طبقہ صرف ٹائم، نیوز ویک، اکانومسٹ (لندن) اور ریڈرز ڈائجسٹ سے تعلق رکھتا ہے۔ عام و خاص علماے کرام، اہل قلم اور اصحاب درس و تدریس کو تو اتنا پڑھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ جو مغرب پر "ایمان" لایا، وہ بلا سوچے سمجھے ان کے جملوں کی جگالی کر رہا ہے، اور جو مغرب کو سرتاپا ضلالت سمجھتا ہے، وہ پڑھے بغیر سطحی قسم کے پامال جملوں سے اپنے طور پر مغرب کے حملے کا جواب دے رہا ہے۔ حالاں کہ یہ رویہ بھی غیر علمی ہے اور تفکر، تدبر اور تعقل کے قرآنی حکم کی نفی ہے۔ اس صورت میں مغرب اور امریکہ میں شائع ہونے والے تحقیقی اور علمی مجلوں تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہی جرائد ان کے پالیسی سازوں، تحقیق کاروں، طالب علموں اور ریاستی اہل کاروں کا ذہن تشکیل دیتے ہیں۔ ان میں ایک دلچسپ نمونہ وہ افراد بھی ہیں، جو مسلم دنیا سے مغرب میں گئے اور مسلم دنیا کے خلاف وعدہ معاف گواہ بن گئے۔ اس طبقے کو مستغربین کہا جاتا ہے۔ جن مطلوب رسائل و جرائد کا ذکر کیا گیا ہے ان تک عوام تو ایک طرف رہے، خواص کی رسائی بھی، عام طور پر ممکن نہیں ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، مغربی فکر کے حامل علمی اور تحقیقی مجلّے، ہماری مذہبی دنیا کی رسائی سے تو باہر ہیں، مگر عام طور پر خود جدید علوم کے ماہرین کی پہنچ سے بھی باہر ہیں۔ اس تناظر میں، زیر تبصرہ مجلّہ "مغرب اور اسلام" اردو علم و صحافت میں ایک انوکھا، دلچسپ اور قیمتی اضافہ ہے اور ایک منفرد تجربہ بھی۔ ابلاغیات

کے دھماکہ خیز دور میں آج کا اردو خواں طبقہ بے خبری اور سطحیت کے جس صحرا میں کھڑا ہے، اس کے لیے یہ مجلّہ علم و خبر کے گلستان کا سا منظر پیش کرتا ہے--- مجلّے میں مغرب کے ۲۰ محقق (ایک اطالوی، ۲ برطانوی اور ۱۳ امریکی) مجلوں سے دو مقالوں کا من و عن اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے ("دور جدید کے بعد کی دہشت گردی" اور "مذہب کے نام پر دہشت گردی") جب کہ ان مجلوں میں اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں ۴۲ مقالوں کا تعارف، مباحث اور تبصرہ مختصر طور پر دیا گیا ہے۔ اس عمل سے بخوبی وہ لہر ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جس کی صدائے بازگشت ہمارے ہاں سیکولر لابی پیدا کرتی ہے۔

مجلس ادارت کے صدر، ڈاکٹر انیس احمد نے اپنے افتتاحیے میں رسالے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے بتایا ہے: "ہم یہ خواہش رکھتے ہیں کہ مغرب اور مشرق میں، اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جو رجحانات پائے جاتے ہیں، انھیں سمجھیں..... ان فکری غلطیوں کی اصلاح کی جائے جو اسلام اور مسلمانوں، اور اسلام کے نام نہاد نقادوں کے درمیان ایک معاندانہ رویے کا سبب بن گئے ہیں..... ہمارا اصل ہدف مغرب کا اسلام کے بارے میں موقف و طرز عمل سمجھنا ہے.... ہم چاہتے ہیں کہ بلا کسی تعبیری کوشش اور تبصرے کے، مغرب کی نمایندہ تحریروں کو، جن کا تعلق اس کے تصور اسلام اور امت مسلمہ سے ہے، اردو خواں طبقے کے سامنے رکھ دیا جائے"۔ (ص ۵)

یہ پہلا شمارہ ہے، اس لیے اس میں مزید بہتری کی گنجایش موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا قدم اٹھانا ہی مشکل ہوتا ہے، گرم سفر رہنے والے مسافت کے کٹھن مراحل طے کر لیتے ہیں۔ اس مجلّے کو ایک دینی اور قومی ضرورت سمجھ کر، استقبال کیا جانا چاہیے۔ دینی، صحافتی، علمی، تعلیمی اور عسکری اداروں کو اس کی افادیت سمجھنا چاہیے۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد اور اس کا شعبہ "تحقیق و مطالعہ اسلام" اس علمی جسارت پر مبارک باد کا مستحق ہے۔ (سلیم منصور خالد)

مدیر کے نام

سلیم منصور خالد ٬ گوجرانوالہ

اشارات "سود کی لعنت سے نجات : اصل رکاوٹ" (مئی ۹۷) بڑے جامع اور بروقت ہیں۔ حکومت کی جانب سے پیدا کردہ مغالطہ انگیزی کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ اب یہ ذمہ داری موجودہ حکومت کے حامی علما کی ہے کہ وہ حکومت کو مثبت پیش رفت پر ابھاریں۔ رسائل و مسائل میں ڈاکٹر انیس احمد اور مولانا عبدالحق بلوچ کے جوابات میں بصیرت٬ حکمت اور علم کی خوشبو رچی بسی ہے۔ اسلام کے اصول شوریٰ پر مولانا مودودیؒ کی تحریر پارٹیوں اور ملک کے معاملات کو چلانے کے لیے روشنی کا مینار ہے۔

پروفیسر سید محمد سلیم ٬ لاہور

الکوحل اور عطریات سے متعلق ایک سائل کے جواب میں عمومی جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے (رسائل و مسائل٬ مئی ۹۷) مجھے یاد پڑتا ہے الکوحل اور ادویات سے متعلق ایک سوال مولانا مودودیؒ مرحوم کے سامنے پیش ہوا تھا۔ مولانا نے انفرادی سطح پر تو جواز کی اجازت دی تھی البتہ اجتماعی طور پر پوری قوم کو گناہ گار قرار دیا تھا جب تک کہ وہ الکوحل کا بدل نہ دریافت کر لے اور شہد کے متوقع بدل کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ اسلامی دور میں عطرسازی کے دو بڑے مرکز تھے۔ ہندستان میں قنوج اور خلافت عثمانیہ میں قسطنطنیہ۔ قنوج میں صندل کی لکڑی سے زمین بناتے تھے۔ پھر ہر قسم کا عطر کشید کرتے تھے۔ صندل جنوبی ہندستان میں وافر مقدار میں ملتا ہے۔ عرب ممالک میں نہیں ملتا۔ قسطنطنیہ میں موم کی زمین پر عطر کشید کرتے تھے۔

شوکت جمیل ٬ اسلام آباد

زرعی اراضی کی تحدید ملکیت (مئی ۹۷) میں مولانا عبدالحق ہاشمی نے بہت ہی عمدہ طریقے سے اظہار خیال کیا ہے لیکن انھوں نے "وراثت کی تقسیم" کی طرف توجہ نہیں دی۔ کوئی بھی شخص کتنی ہی اراضی کیوں نہ جمع کر لے بالآخر اسے اولاد٬ بیوی٬ والدین٬ بہنوں اور بھائیوں میں تقسیم در تقسیم ہونا ہی ہوتا ہے۔

رفیق احمد خان ٬ حیدر آباد٬ سندھ

اپریل کی ۹ تاریخ کو ہماری والدہ ماجدہ اچانک انتقال فرما گئیں۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اگرچہ میں گذشتہ ایک سال سے متواتر ترجمان القرآن پڑھ رہا ہوں مگر مارچ اور اپریل ۹۷ کے شماروں میں خرم مراد صاحب کی وصیت نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ میں اپنی والدہ کی موت کو بے وقت٬ ناحق اور جانے کیا کیا سمجھتا تھا مگر خرم صاحب کی وصیت نے نہ صرف مجھ میں برداشت کا حوصلہ پیدا کیا بلکہ خود بھی موت کے لیے تیار رہنے کا پیغام دیا۔ الحمدللّٰہ میں اللّٰہ کے ہر فیصلے پر اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔ وصیت کا ایک ایک لفظ نقش قدم ہے٬ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ انھوں نے وصیت تمام مسلمانوں کے لیے کی ہے٬ آپ نے شائع کر کے ایک نیک کام کیا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ خرم مراد صاحب کے درجات بلند فرمائے۔ انھیں ہر ہر منزل پر کامیابی و کامرانی عطا کرے اور اپنے سایہ رحمت میں رکھے۔ آمین!

رسالے کا ہر مضمون پراز معلومات اور باعث سکون قلب ہوتا ہے اور ہمارے ایمان کو ہرماہ تازہ کرتا ہے۔

عبدالمتین منیری، دبئی

خرم مراد صاحب کی رحلت کے بعد چراغ راہ کے مدیر کو دوبارہ زندگی مل گئی ہے۔ پروفیسر خورشید صاحب نے اسلامک فاؤنڈیشن اور آئی پی ایس کے انتظامات میں الجھ کر رہنے کے بعد خود کو دوبارہ پالیا ہے، البتہ یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے جو تحریک اٹھائی تھی اس میں جامعیت تھی، اس میں وقت کے مختلف تقاضوں کے ساتھ توازن برتا گیا تھا، یہی دوسری تحریکات کے مقابلے میں اس کا طرہ امتیاز تھا۔ یہ بات صحیح ہے کہ پاکستان جن حالات سے گزر رہا ہے اس میں سیاسی رہنمائی کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے لیکن **ترجمان القرآن**، مولانا مودودیؒ کا پرچہ ہے اور خرم مرادؒ نے اسے اپنا سابقہ کردار واپس دلایا ہے۔ اسی کردار میں ہم اسے دیکھنا پسند کرتے ہیں، اسی میں اس کی دلکشی پنہاں ہے۔

سعودی عرب میں حادثہ حرم کے بعد جو ایک نشات ثانیہ شروع ہوئی ان میں تین مفکر و داعی، ڈاکٹر سفر الحوالی، سلمان العودہ اور ناصر العمر نمایاں طور پر ابھرے۔ ان میں سفر الحوالی، محمد قطب کے شاگرد خاص ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آپ کا سیکولرازم (**العلمانیہ**) پر پانچ چھ سو صفحے کا ایم فل کا تحقیقی مقالہ چھپ چکا ہے اور اب **ظاهرة الارجاء فی الفکر الاسلامی** کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ آٹھ سو صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس مقالے کے مشرف بھی محمد قطب ہیں۔ محمد قطب کی آخری دس سالوں میں جو چند معرکہ آرا کتابیں نکلی ہیں ان میں **واقعنا المعاصر** بہت ہی اہم ہے۔ عالم اسلام کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کے بغیر چارا نہیں۔ افسوس کہ برصغیر میں اس کا تعارف نہیں ہوا۔ محمد قطب نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ امت مسلمہ کے زوال کے اسباب میں سے ایک اہم سبب عقیدۃ ارجاء (یعنی یہ سمجھنا کہ صرف کلمہ پڑھ کر عمل کا مظاہرہ کیے بغیر بھی ایک مسلمان، مسلمان رہ سکتا ہے) کا مسلمانوں میں پھیلنا ہے۔ شاید آپ کے ذہن میں ہو، مولانا مودودیؒ کی خطبات جب شائع ہوئی تھی تو اس وقت علما خصوصاً مولانا حسین احمد مدنیؒ نے آپ کی گمراہی کے جو اسباب بیان کیے تھے اس میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مولانا نے ایمان و عمل کو ایک ہی درجہ دیا ہے، اور عمل کے بغیر ایمان کو بے فائدہ قرار دیا ہے۔ سفر الحوالی کی کتاب کا موضوع بھی یہی ہے۔ کتاب ابھی کل ہی میرے ہاتھ لگی ہے۔

شبیر عباسی، گوجرانوالہ

اپریل ۹۷ کا ترجمان سامنے ہے، مطالعہ کیا، بار بار پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے لیکن باقی احباب کو پڑھانا ہے۔ بالخصوص ترکی کے بارے میں حقائق اور ہاشمی صاحب کا **لوح ایام** پر تبصرہ اور خرم مراد مرحوم کی وصیت ایسی نادر تحریریں ہیں کہ چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ پڑھ کر معلومات کے علاوہ ایک گونہ تسکین ہوئی ہے۔ لیکن سرورق بہ ظاہر بے مقصد نظر آتا ہے جب کہ سرورق کو اندر کا غماز اور پیغام بر ہونا چاہیے۔

○ **ترجمان**: جنوری ۹۷ سے جو سرورق آرہے ہیں یہ کسی نہ کسی دور کے قرآن کی جلدوں کے ڈیزائن ہیں جنھیں محترم خرم مرادؒ کے بیٹے احمد عمر مراد نے کمپیوٹر پر ڈیزائن کیا ہے۔ بارہ مہینوں کے لیے بارہ ڈیزائن خود محترم خرم مراد مرحوم کے منظور کردہ ہیں۔ رنگ اور مہینوں کا تعین بھی خود انھوں نے کیا ہے۔ کسی آیندہ اشاعت میں ہم ان کے ماخذ درج کر دیں گے۔

ہماری مطبوعات

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

سلاجقہ	28:00
دکن کی سیاسی تاریخ	28:00

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: نعیم صدیقی، عبدالوکیل علوی

یہودیت قرآن کی روشنی میں	85:00
نصرانیت قرآن کی روشنی میں	75:00

مولانا جلیل احسن ندویؒ

سفینہ نجات	80:00

سید قطب شہید

معرکہ اسلام اور سرمایہ داری	24:00

حیدر زمان صدیقی

اسلامی نظریہ اجتماع	34:00
اسلام کا نظریہ جہاد	24:00
تعمیری انقلاب اور قرآنی اصول حکمت	24:00
عہد نبوت کے مسائل اور عصر حاضر	5:00

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: سید اسعد گیلانی

حکمت تبلیغ	80:00
اسلام اور مسلم خواتین	30:00
دعوت و تنظیم	30:00

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: اختر حجازی

دارالاسلام	125:00
استفسارات (حصہ اول)	75:00
استفسارات (حصہ دوم)	70:00
تفہیمات (حصہ چہارم)	60:00
تفہیمات (حصہ پنجم)	66:00
خطبات یورپ	90:00
قوموں کے عروج و زوال پر علمی تحقیقات کے اثرات (مجلد)	35:00

سید اسعد گیلانی

خطبات انبیاء	24:00
رسول اکرمؐ کی حکمت (تبلیغ) (مجلد)	120:00
حضور اکرمؐ اور ہجرت	45:00
قرآن، رمضان اور محرم	21:00
تحریک اسلامی کی پہلی کتاب	36:00
تحریک اسلامی کی دوسری کتاب	46:00
اسلام اور سوشلزم	36:00
دوش بدوش	46:00
اسلامی نظریہ ادب (مجلد)	30:00
امت مسلمہ سے خطاب	7:50
تحریک اسلامی کا تعارف	1:00
مولانا مودودیؒ: بچپن، جوانی، بڑھاپا (مجلد)	40:00

ام فاروقؒ

رسول اکرمؐ	48:00

فرزانہ حسن

ازواج مطہراتؓ	30:00

مولانا محمد یوسف اصلاحی

برائیوں کے طوفان میں آپ کیا کریں؟	6:75

عبدالکریم عابد

مولانا مودودی کے سیاسی افکار	24:00

شبیر احمد منظر قدوسی

اقامت دین کا کام کہاں اور کیسے ہو؟	5:00

ڈاکٹر محمد امین

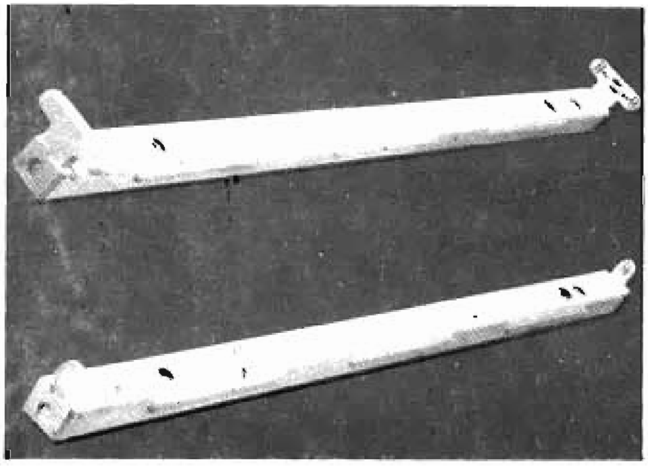
عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	60:00
جسٹس تنزیل الرحمٰن کے اہم فیصلے	2:25

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

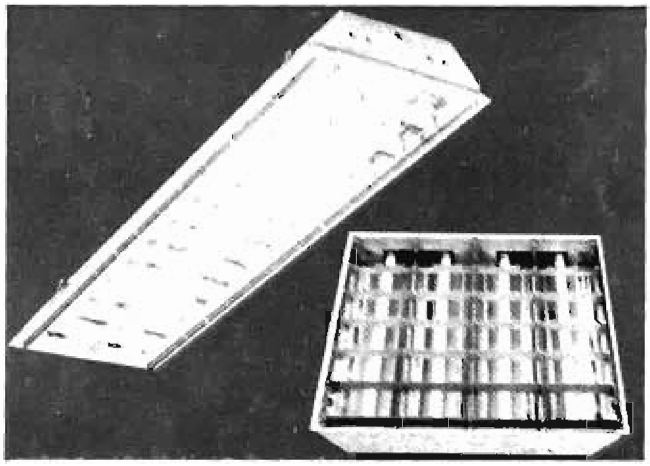
Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,

BATTEN LIGHT



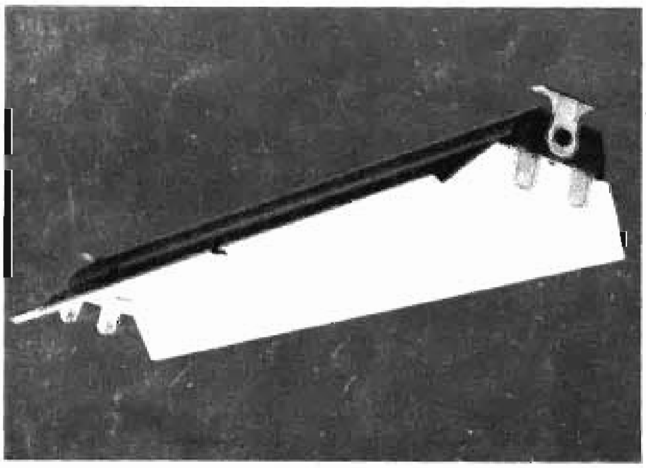
Beautiful slim shape covered ballast tube light fixture for bed rooms, T.V. lounge & drawing rooms etc.

OFFICE LIGHT



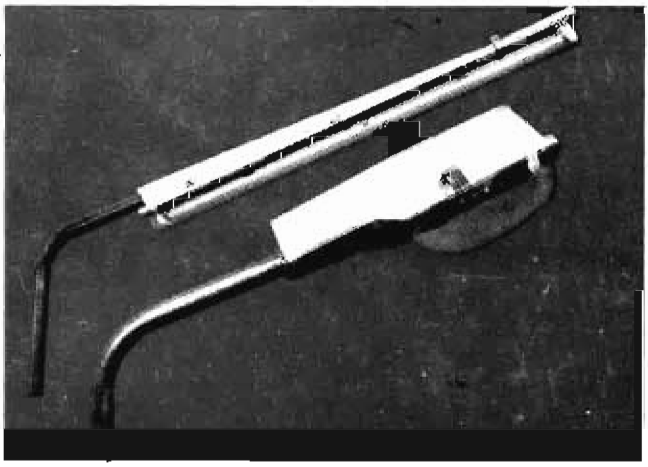
2x2 and 1x4 Recessed and surface fixture with beautiful aluminium louver for maximum and glare free lighting.

INDUSTRIAL LIGHT



Tough fixture with reflector for effective lighting and round the clock operation.

STREET/ROAD LIGHT



Most widely used for streets and roads llighting. Weather resistant and water proof fixtures.

PAKLITE
TUBE LIGHT FITTINGS

PAKLITE ELECTRICAL INDUSTRIES (PVT) LTD.
Sheikhupura Road, Gujranwala, Pakistan. Ph: 0431-272890-93 Fax: 0431-272894